چین کی بہترین کہانیاں

چین کی بہترین کہانیاں

ظ۔ انصاری

مکتبۂ شاہراہ۔ دہلی

پہلی بار ستمبر ۱۹۵۳ء
تعداد ۱۰۰۰

قیمت ۲/۰/۰

(محبوب المطابع۔ دہلی)

فہرست

چینی ادب کی نئی منزل

" انقلاب کے زمانے میں مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں کے درمیان میں رہنے لگا۔ دھیرے دھیرے میں انھیں سمجھنے لگا۔ تب جاکر یہ صورت ہوئی کہ سکول کے زمانے میں بورژوا اسکولوں سے جو بورژوا اور درمیانی طبقے کے جذبات و احساسات میرے اندر پیوست ہو گئے تھے۔ وہ جڑ بنیاد سے بدل گئے۔ اور اسی وقت سے میری یہ کیفیت ہو گئی کہ اب جو بے اصلاح ذی علم لوگوں کا مزدوروں، کسانوں اور سپاہیوں سے موزانہ کر کے دیکھتا ہوں تو مجھے نظر آتا ہے کہ ان ذی علم لوگوں کے صرف دماغ ہی نہیں بلکہ ان کے جسم بھی ناپاک ہیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ پاک صاف لوگوں مزدور اور کسان ہیں۔ چاہے ان کے ہاتھوں میں مٹی لگی ہو یا پیروں میں کیچڑ تھپا ہوا ہو۔ لیکن اس کے باوجود وہ بورژوا اور پیٹی بورژوا (درمیانی طبقے) سے زیادہ پاک صاف ہیں۔ اسی چیز کو میں جذبات اور خیالات کی کایا پلٹ کہتا ہوں —— یعنی ایک طبقے کو چھوڑ کر دوسرا طبقہ اختیار کرنا ...."

(ماؤزے تنگ - ۲ر مئی ۴۲ء نیان)

یہ الفاظ ماؤزے تنگ نے ادیبوں اور فن کاروں کی اس کانفرنس میں کہے تھے جو ادبی و فنی سوالوں پر بحث کرنے ایک ایسے وقت منعقد ہوئی جب جاپانیوں کا پرل ہاربر پر حملہ ہو چکا تھا۔ تمام دنیا ایک زبردست خونی جنگ سے دو چار تھی اور چین اپنی آزادی کی جنگ کے دوسرے دور میں داخل ہو رہا تھا اور نئے حالات کے تقاضوں نے چینی ادیبوں اور فنکاروں کے سامنے بالکل نئے سوال رکھے تھے۔ ۱۹۴۲ء سے پہلے اتنے بڑے پیمانے پر ادبی مسائل کو جانچنا تولنا اور آئندہ کیلئے فیصلہ کرنا چینی ادیبوں کو کبھی نصیب نہ ہوا تھا۔ اس وقت جو فیصلے انھوں نے کئے وہ چینی ادب کو نئی راہوں پر ڈالنے میں اتنے اہم ثابت ہوئے کہ آج بھی چین کا نیا ادب انہی پر عمل کر رہا ہے۔

پچھلے دنوں نئے چین کے متعلق اپنی ناواقفیت دور کرنے کی غرض سے میں نے وہ تمام افسانے، ناول اور کہانیوں کے مجموعے اکٹھے کئے جن سے مجھے مدد مل سکتی تھی اور جو ہندوستان میں مہیا ہو سکے تھے۔ ان میں سب سے قدیم مجموعہ ایک ہربرٹ گائلز کا اور دوسرا ایبرٹ کلارک وغیرہ کا تھا۔ دونوں اب سے پچیس تیس برس پہلے شایع ہوئے تھے اور جن میں کوئی کہانی سترھویں صدی سے پہلے کی نہ تھی۔ سب سے جدید مجموعہ سردار پانکر کا مرتب کیا ہوا ہے جس میں کوئی کہانی انقلاب کی فتح ۱۹۴۹ء کے بعد کی نہیں ہے۔ اس دوران چند اچھے ناولٹ اور طویل مختصر کہانیاں ترجمہ ہو کر چینی لٹریچر اور دوسرے رسالوں میں آئی ہیں۔ اس پورے مسالے کو سامنے رکھ کر چین کی افسانہ نگاری کے متعلق کوئی تاریخی یا تفصیلی بیان دینا تو مشکل ہے لیکن چند باتیں ایسی ہیں جو ابھر کر سامنے آتی ہیں۔

اگرچہ ادب کو جنتری سے ناپنا غلط ہے۔ لیکن محض اندازے کے لئے کہا جا سکتا ہے کہ چین میں مختصر کہانیوں کی عمر بہت مختصر ہے۔ بیسویں صدی کے ساتھ

ساتھ انھوں نے جنم لیا ہے اور بدیشی زبانوں، خاص طور پر جاپانی اور انگریزی کے ترجموں نے ان کے وجود کے لئے زمین تیار کی۔

منچو خاندان کی جاگیردارانہ حکومت کا جب تختہ اُلٹا گیا اور ۱۹۱۲ء میں پارلیمنٹری طرز کی قومی حکومت قایم ہوئی۔ اس وقت بھی جاپانی فرانسیسی اور انگریزی ادیبوں کا عقلیت پسند ادب افسانوں اور کہانیوں کے روپ میں چین کی نوجوان نسل تک پہنچنا شروع ہوگیا تھا۔ یہ ادب زیادہ تر ان طالب علموں کے ذریعہ چین پہنچا جو غیر ملکی یونیورسٹیوں میں فلسفے، سائنس اور ادب کی تعلیم حاصل کرنے نکلے تھے اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد اپنے وطن لوٹتے تھے۔

۱۹۱۲ء کا انقلاب حکومت کوئی اتفاقی واقعہ نہ تھا بلکہ اس کی پشت پر وہ تمام اسباب کام کر رہے تھے جو غلام یا نیم غلام پچھڑے ہوئے ملکوں میں زرعی بحران اور سرمایہ داری کے ابھار کے زمانے میں پیدا ہوتے ہیں۔ دوسرا واقعہ ۱۹۱۹ء میں ظہور پذیر ہوا جب جاپان کے سامراجیوں نے چین کی قومی حکومت کے سامنے ۲۱ شرطیں رکھیں۔ کومن تانگ پارٹی انھیں تسلیم کرنے کے سوال پر دو حصّوں میں تقسیم ہوگئی۔ ایک طرف نوجوان اور وہ ذی علم طبقہ تھا جو انقلاب اور مکمل آزادی اور صنعتی ترقی کے خواب دیکھ رہا تھا۔ جس کے سامنے ۱۹۱۶ء کے انقلاب روس کی مثال تھی۔ دوسری طرف جاگیرداری نظریہ کے گروہ تھے۔ شنگھائی سے تحریک شروع ہوئی اور سارے ملک کے طالب علموں میں پھیل گئی ۴ مئی کو چین کی تاریخ میں پہلی بار طالب علموں کے زبردست مظاہرے ہوئے۔ جن میں درمیانی طبقہ شریک تھا۔ ان مظاہروں سے نئے چین کی اور چین میں نئے رجحانات کے باشعور اور منظم ہونے کی بنیاد پڑ گئی۔

یہاں سے ایک موڑ ہمیں چین کی افسانہ نگاری میں بھی نظر آتا ہے۔ لی تاکاؤ نے اسی زمانے میں (۱۹۱۶ء) ایک مضمون لکھا تھا جس میں نوجوان کو اور صاحب قلم اور ذی علم لوگوں کو

متوجہ کیا تھا۔ اس کے بعد سے ہی یہ تحریک شروع ہوئی کہ قدیم اصنافِ سخن کو چھوڑ کر نئے اصناف اختیار کئے جائیں۔ دیسی طرز میں ادب پیش کیا جائے جو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔

یہی زمانہ ہے جب غیر ملکی جمہوریت پسندوں اور باغیوں کے افسانے، ناول اور مضامین بے تحاشہ ترجمہ ہونے شروع ہوئے۔ انگریزی اور فرانسیسی کے ان ادیبوں کا چین میں مقبول ہونا دراصل اس وقت کے چینی درمیانی طبقے کے ذہن کو پیش کرتا ہے۔ آدم اسمتھ، جان مل، ہکسلے، موپاساں، ایمل زولا، فلابیر، بالزک، سڈنی ویب، برنارڈ شا وغیرہ کے پہنچنے سے وہ زمین فنی لحاظ سے بھی تیار ہوگئی۔ جس سے آگے چل کر نئی ادبی جماعتیں اور نئی ادبی بحثیں پیدا ہوئیں اور جمہوریت پسند اور عقلیت پسند ادب کا فروغ ہوا۔

۱۹۲۲ میں ہانگ کانگ میں بندرگاہ کے چینی مزدوروں نے زبردست ہڑتال کی اور اس طرح چین کے افق پر چند سال کے اندر مزدور طبقہ ایک سیاسی اور سماجی طاقت بن کر نمودار ہوا۔ اسی سال کمیونسٹ کارکنوں کی کانفرنس ہوئی۔ جبکہ پارٹی کے وجود کو صرف سال بھر ہوا تھا انھوں نے فیصلہ کیا کہ تمام جمہوریت پسند عناصر کے ساتھ متحدہ محاذ بنایا جائے۔ یہ متحدہ محاذ قائم نہ ہو سکا۔ لیکن اوّل ۱۹۳۱ میں اور پھر ۱۹۳۷ میں جب جاپانیوں نے باقاعدہ منچوریا سے پورے شمالی چین میں ہاتھ پاؤں پھیلانے شروع کئے اور جنگ چھڑ گئی تو اس متحدہ محاذ کی ضرورت پھر پیش آئی۔ اور ۱۹۴۵ تک یہ قائم رہا۔

اس متحدہ محاذ کے دوران چین کے دیہات میں اگر ایک طرف جاپانی حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا تو دوسری طرف وہ مقامی جاگیردار اور ان کے ایجنٹ بھی تھے جو جاپانیوں سے زیادہ ان کسانوں کو اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ جنھوں نے

پنچایتی حکومتیں قائم کرکے لوگوں کو زیادہ منظم اور تیار کر دیا تھا۔ کومن تانگ پارٹی کی لیڈرشپ چیانگ کائی شیک اور ان کے ہواخواہوں کے ہاتھ میں تھی جنھیں جاپانیوں سے لڑنے کی اتنی فکر نہ تھی جتنی اس بات کی کہ محنت کشوں اور درمیانی طبقے کے لوگوں میں بائیں بازو کے انقلابیوں کا اثر نہ بڑھنے پائے۔ چنانچہ اس زمانے میں نئی ابھرتی ہوئی طاقتوں کو دو مخالف صفوں سے اپنا بچاؤ کرنا پڑتا۔ ایک طرف جاپانی سامراج۔ دوسری طرف چینی جاگیرداری اور اجارہ داروں کا وہ گروہ، جو چیانگ کا پشت پناہ تھا۔

یہ بیس یا بائیس برس چینی افسانے اور ڈرامے اور ناول کی نشوونما اور اس کی تربیت کا سب سے زیادہ اہم دور ہے۔ چین کے بڑے بڑے ادیب اسی زمانے میں منظرعام پر آئے ہیں۔ چین کا جدید ادب اسی بھٹی میں تپ کر نکلا ہے اور جدید ترین افسانہ نگاری کا بیج اسی موسم میں بکھیرا گیا ہے۔

اس وقت تک چینی ادیبوں کے لبوں پر نئے ادب کا نعرہ ضرور تھا لیکن نئے ادب کے نام سے مختلف لکھنے والوں کے ذہن میں مختلف نظریئے تھے اور لکھنے کے طریقے۔ جن کو ایک دوسرے سے کوئی نسبت نہ تھی۔

آسانی کی خاطر ہم اس زمانے کے ادبی حالات کو اپنے ملک میں ۱۹۳۲ اور ۱۹۴۶ کے دوران سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔ اگرچہ ان میں درجے کا فرق ہے لیکن نوعیت قریب قریب ایک ہی ہے۔

اسی عہد میں اچھے باشعور اور نئے ادیبوں نے روسی ادب کی طرف توجہ کی۔ ڈاکٹر لُوشون اور کوموجو اور ماؤتون، جو آج چین کے نئے ادب کے رہنما سمجھے جاتے ہیں (لُوشون کے انتقال کو ۱۶ برس ہوئے) انقلابی ادب کے ترجموں کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے طالسطائی، گوگول، پشکن، چیخوف اور ترگنیف کے علاوہ

دوناچارسکی، اپلے خانوف، فدائیف اور گورکی کے ترجمے کر ڈالے۔ ادھر یہ ترجمے آرہے تھے، ادھر ادبی ہم خیالی کی بنیاد پر ادیبوں کی جتھہ بندی ہو رہی تھی۔ اس جتھہ بندی کے سلسلے میں بڑے بڑے معرکے رہے۔

۱۹۲۰ء میں "ادبی تحقیق سوسائیٹی" قایم ہوئی جس میں ہر خیال کے اچھے اچھے ادیب شامل کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس میں لوگ آ تو گئے لیکن "ادب برائے ادب" اور "ادب برائے زندگی" اور "ادب برائے عوام" کے سارے اختلافات بھی ان کے ساتھ منظر عام پر آئے۔ اختلافات کا نتیجہ مختلف انجمنوں کی شکل میں ظاہر ہوا۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء میں ان ادیبوں نے جو ادب کی خوب صورتی کے نام پر انفرادیت پرستی اور ایہام کی حمایت کرتے تھے ایک جماعت "تخلیقیوں کی سوسائیٹی" بنالی۔ اس میں خاص طور سے وہ ادیب شامل ہوئے جو اوپر کے درمیانی طبقے سے آئے تھے یا ابھی تک ادب کا موضوع درمیانی طبقے میں ہی تلاش کرتے تھے۔ حیرت نہ ہونی چاہئے اگر کہا جائے کہ ایک طرف کوموجو اس کے اہم رکن تھے جو بعد میں انجمن سے رشتہ توڑ کر الگ ہوئے تو دوسری طرف یو، تا فو اس کی اہم شخصیتوں میں شامل تھے۔ جن کا ادب آہستہ آہستہ قنوطی ہوتا چلا گیا۔

اس سوسائیٹی کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک وہ جو چین کی نئی اُبھرتی ہوئی قوت مزدوروں اور کسانوں کو مستقبل کا معمار سمجھنے لگے تھے اور انھیں ادب کا موضوع بنانے کے حامی تھے، دوسرے وہ جو اس شکست و ریخت سے بے خبر تو نہیں تھے مگر "گم شدگی" میں اتنے ڈوبے ہوئے تھے کہ انھیں مستقبل کے فاصلے ناپنے کا یارا نہ تھا۔ یو، تا فو ان ہی ادیبوں میں سے تھا جس کے افسانوں میں آج بھی اس عہد کی چیخ اور بدنظمی کے بہترین نقشے ملتے ہیں۔ وہ اس عہد کے جدید ادب میں سب سے زیادہ مقبول ادیب تھا اور اس میں شک نہیں کہ یو، تا فو کے ہاں جو سوز و گداز ہے

جو درد ہے جو شدید جذباتیت ہے، اس کے افسانوں میں جو کرب اور بے بسی کا احساس ہے دوستوفکی کے علاوہ کہیں اس کی مثال نہیں ملے گی۔

تیسری جماعت اسی اثنا میں ہلال سوسائیٹی قایم ہوئی جن میں اونچے طبقے کے اعلیٰ تعلیم یافتہ لکھنے والے شامل تھے۔ ان میں زیادہ تر تنقیدی مذاق کے لوگ نمایاں تھے خود اس کا بانی ہوشیہ ایک نقاد تھا۔ یہ دونوں جماعتوں سے الگ تھے۔ ادب اور سیاست کے تعلق اور صورت ومعنی کے تعلق کے سوال پر انھیں بائیں بازو کے ادیبوں سے اختلاف تھا۔

مگر ۱۹۳۱ء میں جاپانی حملے نے ملک کو جس طرح ایک جنگی کیمپ بنایا اور چینی کاشتکار کی حالت کے ساتھ درمیانی طبقے کی حالت بھی گرنے لگی۔ یونی ورسٹی کے حلقوں میں عام طور پر اور طالب علموں میں خصوصیت سے کمیونسٹوں کی حمایت اور جاگیردارانہ اثرات کی مخالفت بڑھی۔ اس نے نئی جماعت کو بھی متاثر کیا اور اس میں سے کئی اچھے ادیب ٹوٹ گئے۔ کچھ لوگ کومن تانگ کی "انقلاب دشمن ادبی مہم" میں شریک ہو گئے۔ بڑی تعداد خود انقلابی خیالات کی حامل ہو گئی خاص طور سے تائیں ہان اور ہنگ شن اور جو باقی بچے وہ دنیا و مافیہا سے الگ اپنی خلوت بسا کر بیٹھ گئے اور ادبی کشاکش کے میدان سے ہٹ گئے جن میں خود ہوشیہ شامل تھا اور بعد میں پاچن بھی۔ جو چین کی بہترین ذہانت کا مالک اور صف اول کا افسانہ نگار جس نے "خاندان" جیسا شاہکار لکھا تھا۔

۱۹۲۵ء میں شنگھائی کے نہتے مزدوروں پر جو زبردست فائرنگ ہوئی تھی اور اس کے بعد انقلابی خیالات کے طالب علموں کی مسلسل گرفتاریوں نے، انقلابی خیالات کے ادیبوں کی گرفتاریوں اور پھانسیوں نے ادبی محاذ کو جڑ بنیاد سے متاثر کیا۔ اب تک میدان میں ادیبوں اور فنکاروں کی تین بڑی جماعتیں اہمیت رکھتی تھیں۔

"تخلیقیوں کی جماعت" "ہلال سوسائٹی" اور "آفتاب سوسائٹی" (جو بائیں بازو کے افسانہ نگاروں نے نئی نئی قائم کی تھی) ڈاکٹر لُہ شوَن نے ایک ماہ نامہ نکال کر ان سب کو اپنے طنز و ملامت کا شکار بنایا اور اس میں وقت کے کئی مقبول ادیب لن توٹانگ، چانگ تئیں اور لاؤشیہ ان کے ساتھ آئے۔ ادھر کو تو جو اور یو تافو وغیرہ افسانہ نگاروں اور نقادوں کے مضامین نے پرولتاری اور انقلابی ادب کا سوال اُٹھا دیا تھا۔

چنگ فانگ وو کہ خود تخلیقیوں کے بڑے ادیب تھے۔ انھوں نے ایک مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "ادبی انقلاب سے انقلابی ادب تک"۔ اس مضمون میں خود مصنف نے اعلان کیا کہ ادب کو کھلے عام انقلابی عوام کی خدمت کرنی چاہیے۔

یو-تا-فو نے تخلیقوں سے رشتہ توڑ لیا اور وہ ۳۵ء میں وہ "بائیں بازو کے ادیبوں کی انجمن" میں شامل ہو گئے اور ۳۵ء تک اس میں شامل رہے جب کہ وہ مجبوراً توڑ دی گئی۔

یہ عجیب ہنگاموں اور خلفشار کا زمانہ تھا۔ ذرا ذرا الزامات پر ادیبوں کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں اور کئی ادیبوں کو محض انقلابی ادب پیدا کرنے کے جرم میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ ٹنگ لنگ کے شوہر ناول نگار ہو یہ پنگ کو پھانسی دے دی گئی۔ کئی ترقی پسند پرچوں پر پابندی لگ گئی۔ کئی کے دفتروں میں تالے پڑ گئے۔ ادیبوں نے نام بدل کر لکھنا شروع کر دیا اور جنھیں یوں بھی پناہ نہ ملی وہ مجبوراً ہانگ کانگ، شنگھائی، پیکنگ وغیرہ سے بھاگ کر ینان پہنچنے لگے جہاں کمیونسٹوں نے گہری جڑیں پکڑ لی تھیں اور ان کی پشت پر دیوار تھی۔

اس زمانے میں چین کے جدید افسانے کی کوکھ سے ترقی پسند افسانے نے جنم لیا ہے اور اسی عہد میں چین کے افسانوی ادب کے سب سے بہتر کارنامے سامنے آئے ہیں۔ لُہ شوَن کی طویل مختصر کہانی "پاگل کی ڈائری" ۱۸ء میں آ چکی تھی۔

"آہ کیو کی سچی کہانی" جوان کا شاہکار سمجھی جاتی ہے۔ "صابن کا ٹکڑا" "زہر" "گنگ ای چی" "علاج" وغیرہ اس دور کی پیداوار ہیں۔ یو تا فو کی اعلیٰ درجہ کی کہانیاں جو اپنے اندازِ بیان میں جواب نہیں رکھتیں "ماضی" اور "کھلتا ہوا امن کا پودا" اسی زمانے میں لکھی گئیں (اگرچہ وہ بعد میں خاموش ہو گئے، اور چین چھوڑ کر چل دئے اور ۱۹۴۲ء کے بعد پھر لاپتہ ہو گئے) ماؤ تون اور شن تسنگ دن نے اپنی بہترین کہانیاں اسی دور میں لکھیں۔ ماؤ تون کا ناول "گہن" اسی دور میں شایع ہوا۔ ان میں "سڑک" اور "آدھی رات" بہترین ناول قرار دیئے گئے ہیں۔ "مختصر کہانیوں کا رسالہ" اسی زمانے میں نکلا۔ جس نے چین کی بہترین افسانہ نگار صلاحیتوں کو گمنامی کے گڑھے سے باہر نکالا اور ہمت افزائی کی۔ شن تسنگ دن نے مختلف ناموں سے کئی کہانیاں اسی دور میں لکھیں۔ جن میں "لیمپ" کردار نگاری کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ چانگ تیں یی کی تازہ کہانیوں کے دو مجموعے شایع ہوئے اور غیر ممالک میں بھی ان کے ترجمے ہوئے۔ "لڑکی کا سینہ" ان میں سے ایک ہے۔ لاؤ شی کا ناول "چار نسلیں" اور لیو پائی یو اور چانگ چن تو اسی زمانے میں اپنے تازہ افسانوں کے ذریعہ مشہور ہوئے۔

ایک بات جو اس دور کے افسانوں میں خاص طور پر نظر آتی ہے وہ یہ کہ ان میں پرانی کنفوشین انداز کی اخلاقیات کا بحران پرانے خاندانوں کا ٹوٹنا۔ چینی کسان پر سرمایہ داری کا بوجھ درمیانی طبقے کی مادی اور روحانی ابتری اور مستقبل کی تلاش اور گہری شدید جذباتیت پائی جاتی ہے۔ انفرادی خصوصیات سے قطع نظر یہ اس دور کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ ان کا موضوع جاگیرداری کے اردگرد گھومتا ہے۔ ان کے کردار پرانے بےبس اور مظلوم سماج کے دھواں اُٹھتے ہوئے ملبے سے اُبھرتے ہیں۔ جن میں اکثر کا شعور انقلاب کے بارے بڑی حد تک رہا ہے جو قومی آزادی کی جنگ کا ہوتا ہے اور یہ کہ انقلاب آئے گا تو زمین ان کی اپنی ہوگی۔ انھیں شادی بیاہ کی آزادی

ہوگی۔ اور کوئی سود نہیں لے گا۔ ان کی اولاد کو زبردستی فوج میں بھرتی نہ کرے گا۔
ان میں جھُلسے ہوئے چین کی کراہ زیادہ ہے اور ابھرتے ہوئے چین کی کونپلیں کم۔

۴۲ء شروع ہوتے ہوتے یہ حالات تھے جن سے چین کا ادب خاص طور سے افسانوی ادب گذر چکا تھا۔ کومن تانگ کے گٹ میں صف اول کا کوئی ادیب شامل نہیں ہوا۔ اور جو گئے وہ چند سال کے اندر ہی چینی ادب کے میدان سے گئے۔ کمیونسٹ صفوں میں اور ان کے ہمدردوں کے کیمپ میں ادیبوں اور افسانہ نگاروں کی بہت بڑی تعداد فیصلہ کن انداز میں آچکی تھی اور بقول لُہ شُون ایک "تیسری جنس" تھی ادیبوں کی، جن میں آگے آگے لِن یُوٹانگ اور ان کے رسالے DIALECT. کے لکھنے والے شامل تھے۔ بعد میں لِن یُوٹانگ امریکہ چلے گئے اور جوں جوں بائیں بازو والے ادیبوں کی جیت مکمل فتح میں بدلتی گئی۔ ان کا رویہ مخالفانہ ہوتا چلا گیا۔ بالآخر انھوں نے خود کو نئے چین اور اس کے مستقبل سے بالکل توڑ لیا۔ اب انکی حیثیت وہی ہے جو لوئی فشر، آرتھر کوسلر یا اندرے ژید کی ہو سکتی ہے۔

ابھی جاپانیوں سے چینی سرزمین پوری طرح خالی نہیں ہوئی تھی اور چین کے بڑے حصے پر کومن تانگ کا اقتدار باقی تھا کہ ادبی محاذ پر بائیں بازو کے انقلابی رجحانات کو مکمل فتح نصیب ہوگئی۔ کچھ تو اس لئے کہ ملک میں جاپانیوں کے خلاف جنگ نے ان چینی افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کو ذرا سانس لینے کی مہلت دی جو کومن تانگ کے علاقے میں موجود تھے اور انھوں نے سامراجیوں کے خلاف متحدہ محاذ کے سائے میں اپنے ادب کو اور ادبی محاذ کو طاقت ور کیا۔ دوسری یہ کہ اکثر نے اپنا رشتہ ذہنی طور پر اور باقی نے عملی طور پر انقلابی طاقتوں سے جوڑ لیا اور پھر اس وجہ سے بھی کہ جتنا علاقہ جاپان کے قبضے میں تھا۔ وہاں کے ادیب یا تو بالکل خاموش ہو گئے اور یا ان کی تحریروں نے باقی چین میں کوئی گونج نہ پائی۔ اور کومن تانگ کے علاقے میں جو ایسے

ادیب رہ گئے تھے جنھیں بائیں بازو سے ہمدردی یہ تھی انھیں کومن تانگ حکومت کی بدانتظامی، چین کی پسپائی اور اندرونی حالات نے اتنا متاثر کیا کہ انھوں نے مخالفانہ صف بندی کی جرأت نہ کی۔

اس طرح وہ فتح جو سیاسی اور سماجی مورچے پر کمیونسٹوں کو ۱۹۴۹ء میں نصیب ہوئی۔ وہ ادبی محاذ پر ، سال پہلے ہی حاصل ہو چکی تھی - اور اس پر مہر لگ گئی۔ جب ۱۹۴۲ء میں ینان میں ادیبوں کی وہ تاریخی کانفرنس ہوئی جس میں ماوزے تنگ نے خاص طور سے شاعروں، افسانہ نگاروں اور ڈرامہ نویسوں کی توجہ دلائی تھی کہ وہ مزدوروں، کسانوں اور فوجیوں کو یعنی چینی جنتا کی اصل آبادی کو موضوع سخن بنائیں۔

اس کانفرنس میں فیصلہ ہوا کہ ادبی انداز بیان کو، استعاروں کو، ٹکنیک کو اس طرح عام شکلوں میں ڈھالا جائے۔ انھیں عوامی FORM اس طرح دیا جائے کہ مزدوروں، کسانوں اور فوجیوں کی بڑی سے بڑی تعداد ان سے کچھ حاصل کرے۔

ڈشوں نے ان سے زیادہ ادیبوں کو قریب لانے اور ان کے ادب کو زیادہ سے زیادہ عوام تک پہونچانے کی حکمت عملی یہ رکھی تھی کہ ہر ایک ادیب سے یہ زبردستی نہ کرنی چاہئے کہ وہ انقلابی یا مارکسی نظریئے کو پہلے پورے طور پر ہضم کرے پھر ادب پیدا کرے۔ اور نہ یہ پابندی ہونی چاہئے کہ سب سے سب ایک مقررہ سانچے میں ڈھلے ہوتے ہوں۔ اس حکمت عملی نے اور ماؤ کی ینان والی تقریروں نے ادب کے محاذ کو اور وسیع کیا - اور اعلیٰ درجے کے ادب کے ساتھ معمولی درجے کے ادب اور ادیبوں کی بھی ہمت افزائی ہوئی - اصل نقطہ جس پر سب نے اتفاق کیا یہ تھا کہ ادب کو پرولتاری لائنوں پر آگے بڑھنا چاہئے۔ ایک طرف

ادیب اپنے افسانوں کا اور اپنے اشعار کا موضوع ان عام اور بے نام لوگوں کو بنائیں جو زندگی کی جدّوجہد میں ساتھ نہیں۔ اس کے لئے انھیں عوام کے قریب نہیں بلکہ عوام کے اندر جانا چاہیئے۔ ان کی جدوجہد کے میدان میں تماشائی کی طرح بلکہ خود ایک شریک کار کی طرح شامل ہونا چاہیئے۔ اور دوسری طرف کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ خود پرولتاری طبقے اور دوسرے محنت کشوں اور فوجیوں میں سے نئی ذہانتیں ابھریں، منظر عام پر آئیں اور فنی مہارت حاصل کریں۔

ینان کی سنہ ۴۲ء والی کانفرنس کے بعد دوسری بڑی کانفرنس سنہ ۴۹ء میں پیکنگ، میں ہوئی۔ شاید دنیا میں ادیبوں کی اتنی بڑی کانفرنس کبھی نہ ہوئی ہوگی۔ اس میں ۶۵۰۰ کے قریب ڈیلی گیٹ شامل تھے۔ اور اس نے ادیبوں کے متحدہ محاذ کو اور آگے بڑھایا۔ اگرچہ اس وقت بھی ادیبوں کی ایک تعداد ایسی تھی جس نے شنگھائی، پیکنگ اور اموئی کے علمی علاقے چھوڑ کر جنگی صفوں میں اور ان کے پیچھے رہنا شروع کر دیا تھا۔ کئی ایسے تھے جنھوں نے قلم جیب میں رکھ لیا تھا اور رائفل ہاتھ میں سنبھال لی تھی۔ مثلاً "چینی گاؤں" کا مصنف تیئن چن (یہ اس کا فرضی نام تھا) لیکن سنہ ۴۲ء کی اس کانفرنس کے بعد خاص طور سے سنہ ۴۵ء میں جاپانیوں کی شکست کے اور خانہ جنگی کے شروع ہونے کے بعد کافی تعداد ایسے ادیبوں کی پیدا ہوئی۔ جنھوں نے اس نعرے پر عمل کیا کہ "عوام میں چلو"۔

سنہ ۴۲ء کے بعد سے چینی ادب خاص طور پر افسانوی ادب میں ایک اور اہم تبدیلی پیدا ہوئی ہے، یہ تبدیلی اگرچہ اتفاقی نہیں ہے۔ بلکہ اس کی بنیادیں سنہ ۲۰ء اور سنہ ۴۲ء کے عبوری زمانے میں ہی تیار ہو چکی تھیں۔ تاہم وہ اس اعتبار سے نئی ضرور ہے کہ کہانیوں اور ناولوں میں سے جو ہیرو غائب ہوتے جا رہے تھے۔ وہ پھر واپس آنے لگے ہیں اور خصوصیت سے ایسی کہانیاں لکھی جا رہی ہیں جنھیں

ڈرامے کے قالب میں ڈھالا جا سکے یا فلمایا جا سکے۔ یا دیہات کے عام جلسوں میں سنایا جا سکے۔ پبلک کو لکھی ہوئی کہانیاں سنانے اور اسٹیج کرنے کا رواج اگرچہ بہت قدیم ہے لیکن یہ ایک زمانے کے بعد نئی تکنیک لے کر پھر عام ہو رہا ہے اور اسی کا یہ نتیجہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ مختصر کہانیوں کے مقابلے میں ڈرامہ اور ناول کا رواج بڑھ رہا ہے۔ زیادہ تر پرانے ادیب ناولوں اور ڈراموں کی تصنیف پر لگے ہوئے ہیں۔ لاؤشِ پرانے ادیب ہیں اور انھوں نے مختصر افسانوں کا بہت اچھا ذخیرہ پیش کیا تھا لیکن ابھی دو سال ہوئے جب وہ چین لوٹ کر آئے تو انھوں نے ایک ناولٹ اور دو ڈرامے لکھے۔ ناولٹ "یہ میری زندگی" ہے جس میں ہیرو ایک پولیس والا ہے۔ یہ پولیس والا شاید چینی ناولوں میں بالکل پہلی بار ہیرو کے لباس میں آیا ہے۔ ڈراموں میں انھوں نے وہ تکنیک اختیار کی ہے جو مغربی ڈرامے میں عرصے سے ناپید ہے۔ اس میں نغمے کی گنجائش اسی طرح نکالی گئی ہے جیسے کسی زمانے میں یونانی ڈراموں میں ہوا کرتی تھی۔ ان ڈراموں کے اہم کردار مزدور طبقے سے آئے ہیں اور بالکل اصلی زندگی سے چنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

چاؤ شولی کی کہانی "شیاؤ ار ہی کی شادی" یا "گاؤں کی تبدیلیاں" اور دوسری کہانیاں کافی طویل کہانیاں ہیں۔ ان میں وہ کسان بھی نظر آتے ہیں جو بالکل پچھڑے ہوئے، وہم پرست اور بالکل دبّو ہیں اور وہ کسان بھی جو نسل خاص سے تعلق رکھتے ہیں۔ جنھیں پورے ماحول کی بڑھتی ہوئی طاقتوں نے اور روزمرہ کے زندگی کے تجربوں نے دھیرے دھیرے خود ہی اپنے سانچوں میں ڈھال لیا ہے اور وہ دیہات کی روح ہیں۔ نئے دیہات کی قوت ہیں اور قدیم دیہات کو بدلنے والے بازو ہیں۔ ان میں سے وہ کردار جو خود کو بدل نہیں پاتے۔ میدان سے ہٹ

جاتے ہیں اور جن میں بدلنے کی تھوڑی سی بھی امنگ ہے۔ حالات انھیں راہ سجھا دیتے ہیں۔ چاؤ شولی اگرچہ عبوری دور کے افسانہ نگار ہیں لیکن انھوں نے اپنے افسانوں کو ناولٹ سے قریب، کسانوں کے شعور سے ہم آہنگ اور اسٹیج کے لئے موزوں بنا دیا ہے اور ان سے عوامی ادب کا عملی نمونہ ہمارے سامنے آتا ہے کہ ادبی معیار بھی ان کا نہیں گرنے پاتا۔ اور اس کے باوجود وہ دیہات کی جنتا کے لئے قابلِ فہم اور ان کی تعلیم کا ذریعہ بھی ہیں۔

شن ٹنگ وَن نے ادھر چند کہانیاں لکھیں۔ لیکن عبوری دور کی افسانہ نگاری کا اثر ان پر اتنا ہے کہ وہ نئے چین کے نئے کرداروں کو پوری قوت کے ساتھ پیش نہیں کر سکے۔ جن کی وجہ سے ان پر ادبی رسالوں میں کافی تنقیدیں ہوئیں۔ ان کی کہانی "سرحدی قصبہ" اس تنقید کے بعد کی کہانی ہے اور کافی مقبول ہے۔

ٹنگ لنگ کے ذکر کے بغیر چینی افسانے کا بیان نامکمل رہتا ہے۔ چینی افسانہ نگاروں میں وہ تنہا عورت ہے جو گذشتہ ۲۵ برس سے انقلابی جوش و خروش سے معمور افسانے اور ناول لکھتی رہی ہے۔ اس کی پہلی کہانی جو مقبول ہوئی ۳۱ء میں "پانی" کے عنوان سے شائع ہوئی تھی جس میں ایک تباہ کن سیلاب کا نقشہ تھا اور یہ کس طرح کسانوں نے جان کی بازی لگا کر اس سے بچاؤ کی تدبیر کی۔ اس کے بعد سے اب تک ٹنگ لنگ کی زندگی جدوجہد کے میدان میں گذری ہے۔ وہ قید رہی۔ وہاں سے فرار ہوئی۔ نیان میں پناہ گزین ہوئی۔ پھر چھاپہ مار سرگرمیوں میں حصّہ لیا۔ اور ان کی چشم دید کہانیاں سنائیں۔ تاہم وہ بنیادی طور پر ناول نگار ہے اور ادھر انقلاب کے بعد سے اس کے قلم نے پرولتاری ادب میں کئی ناولوں کا اور کئی ایسی کہانیوں کا جو اسٹیج پر پیش کی جا سکتی ہیں۔ اضافہ کیا ہے۔

نقطۂ نظر اور عمل کی اس اہم تبدیلی نے ادب میں گلہائے نوبہار کھلائے ہیں۔

جن کے ہاتھوں میں کل تک رائفلیں اور کدالیں اور کلیں تھیں۔ وہ فرصت کے اوقات میں قلم سنبھالنا سیکھ رہے ہیں۔

دائی وائی ان میں سے ایک ہے جو پچھلے دنوں کوریا کی جنگ میں والنٹروں کی وردی پہن کر گیا۔ ان میں سے چن تنگ کو کی شخصیت حیرت ناک ہے جو ابھی چند سال ہوئے آزادی کی فوج میں بھرتی ہونے سے پہلے لکھ پڑھ بھی نہ سکتا تھا۔ مگر دو کہانیاں "زندہ آدمیوں کا تالاب" اور "بہن تو" لکھ کر اپنی ادبی صلاحیت سے سب کو چونکا دیا۔ لیوپائی یو بھی ان پرولتاری ادیبوں میں بلند مقام رکھتا ہے اگرچہ اس نے عبوری دور میں لکھنا شروع کیا لیکن ۴۵ء کے بعد والے دور میں اس کی افسانہ نگاری نے خاص مقبولیت حاصل کی ہے۔

یوان چنگ کا ناول "نئے ہیرو اور ہیروئنیں" جدید ترین پرولتاری ادب کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اسی طرح کے ادیبوں کی فہرست روز بہ روز بڑھتی جا رہی ہے اور چینی افسانہ اور ناول کا تازہ تجربہ بتا رہا ہے کہ افسانے، ناول اور ڈرامے کے لئے مثالی کردار اور خاص ڈھب کے کردار تراشنے یا چن لینے اور اُن کا گہرا مشاہدہ کر کے کسی قدر مبالغہ کے ساتھ پیش کرنے کی جو بحث چلی آ رہی ہے وہ چینی ادب میں خود بخود حل ہو جائے گی کیونکہ ادیب اب ان کی تلاش میں نہ تو تماشائی کی طرح گھومتے پھرتے ہیں نہ وہ اپنے خیال اور اپنے فلسفے سے تراش کر شکل صورت دیتے ہیں بلکہ وہ خود ان میں سے ایک ہوتے ہیں اور کہانی کے پلاٹ اور پوری زندگی میں خود اُن کا ایک کردار دوسرے کرداروں کے ساتھ حرکت کرتا ہے۔ یہ حرکت پورے چینی ادب کی ارتقائی حرکت ہے۔

اس مجموعے میں

تمام کہانیاں مختلف مجموعوں سے لی گئی ہیں۔ پہلی کہانی قدیم چینی افسانے

کی ٹکنیک کو پیش کرتی ہے اور اسی کے ساتھ قدیم چینی سماج اور اس کی اخلاقیات کو بھی۔ دوسری تیسری کہانی عبوری دَور کے دو سماجوں کو پیش کرتی ہیں۔ "لمپ" میں شنگھائی کا شہری علاقہ ہے جس میں نظامِ سرمایہ داری اور نظامِ جاگیرداری کے اُلجھے ہوئے رشتے نظر آتے ہیں اور "لڑکی کا سینہ" جاگیرداری مظالم کے مقابلے میں دیہات کی کراہ اور عورت میں بغاوت کی اُمنگ کو خوبصورتی اور دردمندی کے ساتھ سامنے لاتا ہے۔

چوتھی کہانی اپنے زمانے کے اعتبار سے دوسرے دَور کی ابتدا اور پہلے دَور کے خاتمہ کا اعلان کرتی ہے۔ یہ ڈائری کسی پاگل کی نہیں بلکہ اُس فہمی علم نوجوان کی ہے جسے بوسیدہ نظامِ جاگیرداری کے جبر و قہر نے بوکھلا دیا ہے۔ وہ پاگلوں کی طرح زنجیر توڑنے کا جذبہ رکھتا ہے لیکن توڑ سکنے کی قوت نہیں پاتا اور نہ اس کا پورا شعور رکھتا ہے۔

یہ قوت اور یہ شعور پانچویں کہانی کے ہیرو میں ہے جو دیہات کے عام گھرانے میں پلا ہے اور جسے جاگیرداری اور سامراج کے خلاف منظّم، باقاعدہ اور مسلسل جدوجہد نے تجربہ عطا کیا ہے اور آگے بڑھایا ہے۔ اس طرح آخری کہانی چین کے جدید ترین سماج کے تانے بانے ہمیں دکھاتی ہے۔

یوں پانچ کہانیوں میں یہ مجموعہ چین کے اچھے افسانوی ادب کی نمائندگی کچھ نہ کچھ کر دیتا ہے۔ یہ تمام کہانیاں چین کی بہترین کہانیاں کہی جاسکتی ہیں یا نہیں —— یہ میں نہیں بتا سکتا لیکن بہترین کہانیوں کے ایک اچھے ذخیرے میں انھیں ضرور شمار کیا جاسکتا ہے۔

ظ۔ انصاری

۷۰-۱- ای کیڈل روڈ- بمبئی ۱۶

راجکماری کنول

از: پھو سنگ. لنگ

یہ کہانی قدیم چینی ادب سے لی گئی ہے۔ قدیم چین میں مختصر کہانیوں کا آج کا جیسا دستور نہیں تھا۔ تاہم جو کہانیاں "الف لیلہ" کی داستانوں کی طرح سینہ بہ سینہ چلی آتی تھیں اُن میں کاٹ چھانٹ کر کے ایک ادیب پھو سُنگ لِنگ نے مرتب کیا۔ کہانیوں کی یہ سب سے پرانی کتاب ہے جو ترجموں کی شکل میں آج بھی دست یاب ہے۔

مصنّف کے بارے میں بہت کم باتیں معلوم ہو سکی ہیں۔ شنگھائی سے ایک زمانے میں "چینی اسٹوڈیو کی عجیب کہانیاں" کے نام سے مجموعہ شائع ہوا تھا۔ اُس میں یہ کہانی بھی شامل تھی۔ اُس کے انگریزی مترجم اور دوسرے چینی سوانح نگاروں کے ذریعے مصنّف کے متعلق پتہ چلا ہے کہ:

پھو سُنگ لِنگ ۱۶۲۲ء میں شن تانگ کے مقام کو چیا وُ میں پیدا ہوا تھا۔ ایک زمانے تک وہیں رہا۔ ۱۶۵۱ء میں اُس نے شن تانگ یونی ورسٹی

کا آخری امتحان دیا اور فیل ہو گیا۔ اُسے سرکاری افسر بننے کے لئے یہ تعلیم دی جا رہی تھی لیکن امتحان میں ناکامی کے بعد اُس کا دل اُچاٹ ہو گیا۔ اُس نے اپنی ساری توجہ ادب اور تنقید کی طرف لگا دی اور چین کے دیہات میں بکھری ہوئی کہانیوں کو اپنے مخصوص طرزِ بیاں میں ڈھال کر پیش کیا۔

پھُو سُنگ لِنگ کی کہانیوں کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ خاص طور سے اُس کے طنزیہ اندازِ تحریر نے بعد کے ادیبوں کو متاثر کیا۔ ان کہانیوں کو سترھویں صدی کے ادبِ عالیہ میں شمار کیا جاتا ہے اور مصنّف کو قدیم دَور کا آخری "زندۂ جاوید مصنّف" قرار دیا گیا ہے۔ تمام دُنیا کی مختصر کہانیوں کے دو اہم مجموعوں میں قدیم چین کے ادب کی نمائندگی اسی کی کہانیوں سے کی گئی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ مصنّف کی کہانیوں میں قدیم جاگیرداری عہد کے چین کی سیدھی، سچی اور مکمّل تصویر نظر آتی ہے۔ زیرِ نظر کہانی میں جو ایک خُوب صورت سماجی طنز ہے اس کا پس منظر بھی وہی سماج ہے جو چین میں ۱۹۴۷ کے بعد سے دم توڑنے لگا اور ہندوستان میں ابھی تک سانس لئے جا رہا ہے۔

پھُو سُنگ لِنگ اس مصنّف کے نام کا اصلی تلفّظ ہے جو انگریزی میں ذرا بدل جاتا ہے۔ اسی طرح کہانی کی عبارت میں بھی انگریزی ترجمے کے بجائے چینی لب و لہجہ اور قدیم اندازِ بیاں کو باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کہتے ہیں کہ قدیم زمانے میں چیاؤ چو راج میں ایک شخص تھا۔ بتانے والوں نے اس کا نام تاؤ ژون بتایا ہے۔ ایک روز وہ دن چڑھے سو رہا تھا کہ اچانک اس نے دیکھا، ایک آدمی اُس کے قریب کھڑا ہے جس نے حریری لباس پہن رکھا ہے۔ اُس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کوئی پیغام پہنچانے آیا ہو۔

تاؤ ژون نے پوچھا کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟ تو اُس آدمی نے جواب دیا۔ مجھے میرے آقا نے بھیجا ہے اور میں آپ کے لئے بُلاوا لایا ہوں۔

تمہارا آقا؟ وہ کون ہے؟ تاؤ نے پوچھا۔

قاصد نے اس کا جواب نہیں دیا۔ صرف اتنا کہا کہ میرا آقا یہاں سے بہت دُور نہیں رہتا۔ آپ مہربانی کر کے میرے ساتھ چلے چلئے اور خود مل لیجیے۔

چنانچہ وہ دونوں ساتھ ساتھ چل دیے۔ تھوڑی دیر بعد تاؤ نے دیکھا کہ بے شمار سفید عمارتوں کا ایک سلسلہ دُور تک چلا گیا ہے۔ یہ عمارتیں ایک کے اُوپر ایک بلند ہوتی گئی ہیں اور لیمو کے گھنے باغیچوں میں ڈھکی ہوئی ہیں۔ وہ آدمی تاؤ کے آگے آگے چل رہا تھا۔ غیر معمولی شکل، صورت اور حیرت ناک قسم کے اَن گنت دروازوں کے ایک لمبے سلسلے سے وہ شخص تاؤ کو گزارتا ہوا لے گیا۔ راستے میں تاؤ نے بہت سے ایسے

مردوں، عورتوں کو دیکھا جو اپنے حُلیے سے سرکاری اور درباری معلوم ہوتے تھے۔ اُن میں قریب قریب سبھی نے اس قاصد سے پُوچھا "کیا تاؤ ژون آئے ؟"

اُن کے جواب میں ہر بار وہ شخص تاؤ کی طرف سر کا اشارہ کرکے مُسکرا دیتا تھا۔

بہت دیر تک اسی طرح گزرتے رہنے کے بعد وہ قاصد تاؤ کو ایک ایسی ہستی کے پاس لے گیا جو اعلیٰ مرتبے کا کوئی منصب دار یا اہم درباری نظر آتا تھا۔ اس منصب دار نے بڑے تپاک اور آداب کے ساتھ تاؤ کو تسلیم عرض کی اور اُسے لئے ہوئے ایک عالی شان محل کی طرف چلا۔ محل کا شان و شکوہ ایسا تھا کہ دیکھنے والے پر حیرت طاری ہو جائے۔

تاؤ ذرا جھجکا۔

"آپ کی قدر دانی اور عنایت کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں لیکن افسوس کہ مجھے حضورِ والا سے تعارف کا شرف حاصل نہیں ہے اور اس طرح اپنے وجود کو یہاں دخیل کرتے ہوئے مجھے کچھ حجاب سا محسوس ہوتا ہے" تاؤ نے کہا۔

منصب دار نے جواب دیا "ہمارے شہزادۂ والا قدر ایک عرصہ سے آپ کا نامِ نامی جانتے ہیں اور اُنھیں معلوم ہوا ہے کہ آپ اعلیٰ اوصاف کے انسان ہیں اور جلیل القدر خاندان کے فرد ہیں۔ انھیں خواہش تھی کہ آپ کو ان سے اور زیادہ قُرب اور رُوشناسی حاصل ہو۔"

"مگر آپ کے شہزادۂ والا قدر کون ہیں ؟" تاؤ نے پھر سوال کیا۔

"چند لمحوں بعد آپ بذاتِ خود اُن کے رُو بہ رُو ہوں گے" منصب دار نے جواب دیا۔ وہ ابھی یہ کہنے ہی پایا کہ دو نہایت خوش رُو اور حسین خواصیں زرق برق کے سامان سے لدی ہوئی آئیں اور تاؤ کو اپنے ہمراہ لئے ہوئے چلنے لگیں۔ بہت سے ایوانوں اور محلات سے گزرنے کے بعد خواصوں نے تاؤ کو اس عالیشان مقام تک

پہنچا دیا جہاں شہزادۂ عالی وقار تخت شاہی پر جلوہ افروز تھے۔

جوں ہی شاہزادے کی نظر تاؤ کے چہرے پر پڑی وہ خیر مقدم کے لئے تخت سے اُتر آئے اور بہ نفسِ نفیس تاؤ کو اس فخر و عزت کے مقام پر بٹھایا۔ تاؤ کے تشریف رکھنے کے بعد شاہزادۂ عالی گہر نے حکم دیا کہ خاصہ حاضر کیا جائے۔ چنانچہ اشارہ پاتے ہی کئی طشت لائے گئے جن میں لذیذ غذائیں آراستہ تھیں اور جام و صہبا کی جلوہ افروزی تھی۔

ابھی تک حیرت و استعجاب سے تاؤ کی آنکھیں خیرہ ہو رہی تھیں۔ اُس نے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس تزئینِ شاہی کو دیکھا۔ ایک طغرے پر اس کی نظر پڑی جس پر لکھا تھا "دربار کاشیا" اس لفظ کو پڑھنے کے بعد بھی تاؤ کی تسکین نہ ہوئی۔ اس کی عقل حیران تھی کہ "دربار کاشیا" کی یہ کون شخصیت ہے جو اس طرح تاؤ کی میزبانی کر رہی ہے۔ شاہزادۂ عالی وقار نے تاؤ کے حیرت و استعجاب کو محسوس کیا اور وہ یوں گویا ہوئے:

"جناب والا کو اپنی ذات سے اتنا قریب پانے کی سعادت میں ہمیں ایک تعلق خاطر محسوس ہو رہا ہے۔ ہم اس اعزاز و سعادت کو ایک آشنایانہ وابستگی سمجھتے ہیں۔ آیئے خود کو لذت و مسرت کی موجوں میں بہا دیں اور سارے شکوک و شبہات کو "غرقِ مئے ناب" کر ڈالیں۔"

ان الفاظ کا سُننا تھا کہ تاؤ نے عزم کر لیا کہ اب وہ جن حالات کے درمیان خود کو پا رہا ہے اُن کے متعلق کوئی تشویش نہ کرے گا اور اپنے وجود کو اس جشن کی تب و تاب میں محو کر دے گا۔

جام و مینا کے دَور چلنے لگے۔ جب کئی دَور ہو گئے تو دُور سے تاؤ کو رقص و نغمہ کی صدا سنائی دی۔ عیش کی اس فرصت میں بنسری کی دل نشیں آواز اور نغمہ کی لہر

اور لطف دینے لگی مگر نے اور نغمہ کے اس دور میں کہیں طبلے اور تاشے کی آواز نہ تھی۔

شاہزادۂ عالی تبار اس کے بعد تاؤ کی جانب مخاطب ہوئے اور فرمایا: "آیئے ذرا ہماری آپ کی بیت بازی بھی ہو جائے[1]۔ یہ کہہ کر اُنھوں نے خود ایک مصرع ارشاد کیا" یہ قصرِ کاشیا کی سمت رُخ کرتا ہے ہر زیرک"

شاہزادۂ باوقار یہ مصرع پڑھ کر خاموش ہوئے تو تمام مصاحبین اس مصرع کا جواب سوچنے میں محو ہو گئے۔ ابھی وہ ساکت وصامت تھے کہ تاؤ نے برجستہ جواب دیا

"یہ قصرِ کاشیا کی سمت رُخ کرتا ہے ہر زیرک
کنول محجوب ہے آیئنۂ عقلِ مصفا کا"

"جناب کا ستارہ اَوج پر ہے جو یہ مصرعہ لبوں تک آیا" شاہزادے نے خوش ہو کر اتنا ارشاد کیا۔ ابھی تمام حاضرین تعریف وتحسین کے الفاظ ادا کر رہے

---

[1] ہندوستان کی طرح قدیم چین کے درباروں میں بھی شطرنج اور گنجفہ کی طرح بیت بازی ایک شاہی تفریح ہوا کرتی تھی اور اُس میں مقربانِ خاص کو شریک کیا جاتا تھا۔ ہمارے یہاں کی بیت بازی اور چینی بیت بازی میں تھوڑا سا فرق بھی ہے ہمارے یہاں جواب دینے والا سوال کرنے والے کے شعر کے دوسرے مصرع کے آخری حرف کو بنیاد بناتا ہے اور وہ شعر پیش کرتا ہے جو اُسی حرف سے شروع ہوا ہو۔ چینی بادشاہوں کے یہاں بیت بازی کا دستور یہ تھا کہ دوسرے مصرع کا ہر ایک لفظ سوال کرنے والے کے پہلے مصرع کا ترکی بہ ترکی جواب ہو۔ اس فرق کی وضاحت کے ساتھ میں نے چینی بیت بازی کو ہندوستانی بیت بازی فرض کر لیا ہے۔ (ظ۔ا)

تھے۔ شاہزادے نے فرمایا "تمہیں علم ہونا چاہیئے کہ میری بیٹی کا نام ہے کنول۔ میں طلب کرتا ہوں، تم خود اُسے دیکھ سکتے ہو۔" شاہزادہ کے اشارے پر فوراً اطلاع پہنچ گئی اور چند لمحے بعد پائل کی چھنک اور زیورات کی جھنکار کے علاوہ عطر کی لپٹوں نے سب کو چونکا دیا کہ راجکماری کی سواری آ رہی ہے۔

راجکماری کا سن و سال سولہ اور سترہ کے درمیان ہوگا۔ وہ اپنی خواصوں کے ہمراہ چلی آ رہی تھی۔ اُس کا حُسن ایسا قیامت کا ٹکڑا تھا کہ اُس کے سامنے تاؤ کی آنکھیں چوندھیا گئیں۔ اُس کی زبان پہ تالا پڑ گیا۔ وہ صرف آنکھوں سے زبان کا کام لیتا رہا اور شاہزادی کے جمالِ دلفروز کو تکتا رہ گیا۔ شاہزادۂ عالی وقار نے چشم و ابرو کے اشارے سے اپنی دُخترِ نیک اختر کو حکم دیا کہ ان کے سامنے کورنش بجا لاؤ۔ چنانچہ شاہزادی ماہ جبیں اس حکم کی تعمیل کر کے رُخصت ہونے لگی۔

شاہزادے نے اپنی دانشمندی سے اس راز کو پا لیا کہ تاؤ بیک نظر راجکماری کنول کے عشق میں گرفتار ہو چکا ہے۔ شاہزادے نے کسی پہلو سے یہ تذکرہ چھیڑ دیا کہ وہ اپنی دُخترِ نیک اختر کے لئے ایک مناسب بَر کا انتخاب کرنا چاہتے ہیں۔ تاؤ پر ابھی تک ایسی محویت طاری تھی کہ اُسے خبر تک نہ ہوئی شاہزادہ کیا ارشاد کر رہا ہے۔ وہ اس وقت دُنیا و مافیہا سے بے خبر تھا اور شاہزادی کے تصور میں گُم ہو چکا تھا۔ ایک درباری نے اُس کا شانہ پکڑ کر ہلایا اور کہا "سُنیئے! شاہزادۂ عالم پناہ کیا ارشاد فرما رہے ہیں۔ تاؤ یہ جملہ سُن کر چونکا اور اپنے ہوش میں آتے ہی اُس نے شاہزادے سے معذرت کی اور محفلِ خاص سے اُٹھ جانے کی رُخصت چاہی۔

اپنے دربار میں آپ کا خیر مقدم کر کے مجھے جو مسرت حاصل ہوئی ہے اس کا بیان لاحاصل ہے مگر "حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد" اگر آپ نے ہمیں اپنے دل سے فراموش نہ کیا تو اُمید ہے کہ پھر آئندہ کبھی شرفِ ملاقات بخشیں گے۔"

شاہزادے نے حکم دیا کہ تاؤ کی سواری جائے گی اور اعزاز کے ساتھ اُسے گھر تک پہنچایا جائے گا۔

تاؤ رخصت ہو کر چلا تو راستے میں اُس درباری نے جو ہمرکاب تھا تاؤ سے عرض کیا کہ جس دم شاہزادے نے خود ہی کھلا اشارہ کیا تھا کہ آپ اُن کی دُخترِ نیک اختر راجکماری کنول کو اپنی زوجیت میں لے لیں تو آپ خاموش کیوں رہے؟ تاؤ ابھی تک مبہوت تھا اور جب اُسے احساس ہوا تو وہ بہت پچھتایا کہ ایسا زرّیں موقعہ اُس نے ہاتھ سے نکل جانے دیا۔ اسی افسوس کے ساتھ وہ چلتے چلتے اپنے گھر تک پہنچ گیا۔ گھر پہنچتے ہی اُس کی آنکھ کھل گئی۔ سورج غروب ہو چکا تھا۔ تاؤ غم و افسوس کے دُھندلکے میں لپٹا ہوا بیٹھا رہا۔ اُسے غم تھا کہ کیسا اچھا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔ آنکھ کھل جانے سے سارا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا تھا۔ شاہزادی کا تصوّر اب بھی اُس کے دل و دماغ پر طاری تھا۔ بعد میں رات کو جب وہ بستر پر لیٹا تو اُس نے چراغ بجھا دیا۔ وہ اپنے دل میں یہ اُمید لے کر سویا کہ شاید خواب کا ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے ہاتھ آجائے۔

مگر کئی راتیں یوں ہی گزر گئیں۔ جو خواب گزر چکا تھا وہ پھر واپس نہ آیا۔ ایک دن وہ اپنے کسی دوست کے گھر سو رہا تھا کہ دربارِ شاہی کا کوئی منصب دار اچانک حاضر ہوا اور عرض کیا کہ آپ کو شاہزادے نے طلب فرمایا ہے۔

ایک بار پھر تاؤ نے دیکھا کہ وہ اُن ہی عالی شان اور پُرشکوہ ایوانوں کے بلند و بالا در و دیوار کے درمیان کھڑا ہے۔ وہ ادب کے ساتھ شاہزادے کے حضور میں کورنش بجالایا اور شاہزادے نے پھر اُسے نہایت تپاک اور خندہ پیشانی کے ساتھ خوش آمدید کہا۔

شاہزادے نے تاؤ سے کہا کہ مجھے معلوم ہے کہ تم کنول کے عشق میں گرفتار

ہو گئے ہو اور اگر تم چاہو تو برات کے شادیانے کا فوراً حکم جاری کر دیا جائے۔
نوجوان تاؤ نے اپنی رضامندی ظاہر کی اور اسی کے ساتھ شادیانے بجنے لگے، نذریں گزرانی جانے لگیں اور سہاگ بھرے جانے کی تیاری ہونے لگی۔

آخر وہ لمحہ بھی آیا جب سب کو خبر دی گئی کہ راجکماری کا سہاگ بھرا جا چکا ہے اور وہ زیب و زینت کے تمام سامان سے فارغ ہو گئی ہیں۔ ہر طرح تیار ہو کر راجکماری روانہ ہوئی۔ خواصیں اُس کے جلو میں چل رہی تھیں۔ کچھ خواصیں دامن تھامے ہوئے تھیں۔ راجکماری کی سواری نکلی تو سُرخ حریری نقاب اُس کے سر پر پڑا تھا۔ کڑھے سے کڑا بجنے کی آواز اس طرح آ رہی تھی جیسے آہستہ آہستہ کوئی جھرنا جاری ہے۔ ننھے ننھے خوبصورت پاؤں رکھتی ہوئی وہ اپنے منگیتر تک آ پہنچی۔

تاؤ نے راجکماری کے سامنے سر جھکاتے ہوئے عرض کیا "آپ کے حضور میں میرے لئے موت کو بھول جانا بھی سہل ہے لیکن بے ادبی معاف، مجھے ایک بات تو بتا دیجئے۔ کہیں یہ سب خواب تو نہیں ہے؟"

"جانِ من یہ سب خواب کی باتیں کیونکر ہو سکتی ہیں؟" راجکماری نے دھیمے نرم لہجے میں جواب دیا۔ "یہ خواب کیسے ہو سکتا ہے جب آپ اور میں پہلو بہ پہلو موجود ہیں؟"

دوسرے دن صبح کو تاؤ نے راجکماری کے حسین چہرے کے شبانہ نقش و نگار کو بغور دیکھا اور ایک ٹیکلے کر راجکماری کی کمر ناپنے لگا۔ کمر کو ناپ لینے کے بعد اُس نے انگلیوں اور پیروں کا ناپ لیا۔

"کچھ خبط الحواس ہو گیا؟" راجکماری نے حیرت سے مسکرا کر پوچھا۔
تاؤ نے جواب دیا۔

"نہیں یہ بات نہیں ہے بلکہ مجھے کئی بار دھوکا ہو چکا ہے۔ اب کی بار میں پوری یادداشت محفوظ کر لینا چاہتا ہوں۔ اگر کہیں یہ خواب نکلا تو کم از کم تمہاری ایک نشانی تو میرے پاس رہ جائے گی۔"

ابھی وہ دونوں راز و نیاز میں مصروف تھے کہ اتنے میں ایک خواص دوڑی ہوئی آئی اور اُس نے پریشانی کے عالم میں یہ خبر دی۔

"حضور غضب ہو گیا۔ بڑا غضب ہو گیا۔ ایک شیطان صفت خونخوار دیو محل کے پاس آ پہنچا ہے۔ شاہزادہ عالم پناہ عقبی محل میں پناہ گیر ہو گئے ہیں۔ کوئی بڑی تباہی آنے والی ہے۔"

تاؤ پریشان ہو گیا اور دوڑا ہوا عالم پناہ کو تلاش کرتا ہوا اُن کے حضور میں پہنچا۔ اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب رواں تھا۔ انھوں نے تاؤ سے التجا کی کہ ایسے نازک وقت میں وہ انھیں چھوڑ کر نہ جائے۔ عالم پناہ نے کہا۔

"ہمارا تمہارا رشتہ اس آسمانی مصیبت نے اور مضبوط اور پائیدار کر دیا ہے۔ میری تمام سلطنت زیر و زبر ہو جائے گی۔ خدا کے لئے بتاؤ میں کیا کروں؟"

تاؤ نے التماس کیا کہ کچھ مجھے بھی بتائیے۔ اصل معاملہ کیا ہے؟ شاہزادے نے تخت پر ایک خبر نامہ پھیلا دیا اور کہا کہ تم اسے کھول کر پڑھ لو، تمہیں خود معلوم ہو جائے گا۔ تاؤ نے اس مفصل خبر نامے کو پھیلایا اور پڑھنا شروع کیا (وہ ایسے انداز اور ایسی زبان میں لکھا تھا جو ایک درباری رقعہ گزار اُس خبر نامے میں استعمال کرتا ہے جس میں بادشاہ یا اُس کے نائب کو کسی بڑے واقعہ سے مطلع کیا جاتا ہے) تمام القاب و آداب کے بعد اصل عبارت یہ تحریر تھی کہ:

یہ فدوی حقیر، پُر تقصیر، ملکِ قبر وزیرِ اُمورِ خارجہ حضورِ اقدس میں بہ ادب عرض کرتا ہے کہ ایک دیو شیطان صفت، عفریت ہیئت کہ مثل اُس کا کسی نے دیکھا

نہ سُنا ظہور پذیر ہوا ہے۔ فدوی کی حقیر درخواست بندگانِ عالی سے یہ ہے کہ سلطنت کی بنیاد برقرار رکھنے کی خاطر محلّاتِ شاہی کو خطرے کی زد سے فوراً بچا لیا جائے اور یہاں سے کسی اور مقام کی طرف منتقل کر دیا جائے۔ فصیلِ قلعہ کے پہلے دروازے کی چوکی کے متعینہ حاکم نے ابھی خبر بھیجی ہے کہ پانچویں قمری مہینے کی چھٹی تاریخ سے ناگہانی بلائے آسمانی قلعہ معلّٰی کی راہ میں پھن پھیلائے، دُم پھیلائے ظاہر ہوئی ہے کہ قد اُس شیطان کا دس ہزار فٹ کا ہوگا۔ اب تک وہ حضورِ پُرنور کی جاں نثار رعایا کی ۱۳ ہزار ۸۰ سو جانوں کو لقمہ بنا چکا ہے۔ لقمہ اُس کا لقمۂ اجل اور پھنکار اُس کی صدائے دُہل۔ ہر طرف تباہی اور ہر جانب ویرانی و سراسیمگی کا عالم ہے۔ جوں ہی خبر اس فدوی تک پہنچی یہ خود برائے تحقیق و تصدیق جائے اُس عفریت کے روانہ ہوا۔ وہاں حقیرِ پُرتقصیر نے دیکھا کہ ایک زہر خیز اور لرزہ انگیز اژدہا ہے۔ اژدہے کا سر آسمان کی طرح بلند بالا اور دو آنکھیں آبشار کے دھارے کی طرح آفت کا پرکالا۔

دانت دُسنگے ہیں گورکن قضا کے
دو نتھنے رہِ عدم کے ناکے

وہ سر اُٹھاتا ہے تو عمارتیں کی عمارتیں اُس کے حلق میں گھسی چلی جاتی ہیں اور جب دست و بازو پھیلاتا ہے تو در و دیوار زمین کے ہموار ہو جاتے ہیں۔ قدیم سے قدیم روایات میں کہیں ایسی ہیبت ناک آفتِ ارضی و سماوی کا ذکر نہیں آیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے محلّات، عمارات اور مقدس مقامات سب کے سب صرف اپنے آخری وقت کے انتظار میں سہمے کھڑے ہیں۔ نظر بریں ہم فدویانِ بے تمکین کی درخواست حضورِ انور میں یہ ہے کہ حضورِ والا خانوادۂ شاہی کی جان بچائیں اور انھیں لے کر کسی سمت روانہ ہو جائیں جہاں امن اپنی راہ پائے اور مسرت دامن پھیلائے۔ فقط۔ لازم تھا۔ عرض کیا گیا۔

ابھی تاؤ نے یہ آخری جملہ پڑھ کر ختم ہی کیا تھا کہ اتنے میں ایک قاصد خاص دوڑتا ہوا پہنچا اور چلایا "شیطان۔ آفت بے اماں"

پورا دربار یہ جملہ سن کر لرز گیا اور تاؤ کو ہر طرف سے آہوں اور کراہوں کی صدا سنائی دینے لگی۔ ہر جانب ہائے واویلا مچی ہوئی تھی۔

شاہزادۂ عالم پناہ کا منھ سرخ ہوا اور چہرہ زرد پڑ گیا۔ انھوں نے تاؤ سے گڑ گڑا کر کہا کہ تم صرف اپنی جان کی سلامتی چاہو۔ اپنا بچاؤ کر لو اور اپنی زوجہ کی فکر نہ کرو کہ اسی کی بدولت تم اس مصیبت میں گھر گئے ہو۔

راجکماری کنول بھی نزدیک ہی کھڑی ہوئی کف افسوس مل رہی تھی۔ تاؤ کے قدموں سے لپٹ گئی اور عاجزی کے لہجہ میں بولی "مجھے چھوڑ کر نہ جانا۔ میرے سرتاج"۔

تاؤ نے محبت و شفقت کے ساتھ اسے اٹھایا اور شاہزادے کے سامنے ادب سے خم ہوتے ہوئے عرض کیا کہ "گستاخی معاف ہو۔ ایک درخواست اس کمترین کی ہے"۔ حکم ہوا کہو۔ تاؤ نے ادب و احترام سے پھر عرض کیا "اگر شرف قبولیت بخشا جائے تو گھر اس فدوی کا پناہ گاہ کے طور پر خانوادۂ شاہی کی خدمت کیلئے حاضر ہے"۔

شاہزادے نے جذبات تشکر سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

"ایسے نازک وقت میں شرف قبولیت بخشنے نہ بخشنے کا کوئی سوال سوچنا ہی ممکن نہیں۔ ہم آپ سے التجا کرتے ہیں کہ جتنی جلد ممکن ہو ہمیں یہاں سے لے چلئے"۔

تاؤ اس شاہزادیٔ مہ جمال کو لئے ہوئے نہایت تیز رفتاری کے ساتھ اپنے گھر پہنچ گیا۔ اگرچہ تاؤ اپنے گھر کے حقیر اور ادنیٰ ہونے پر نہایت انکساری اور شرم محسوس کرتا جاتا تھا اور اس کی معذرت بھی برابر پیش کر رہا تھا لیکن شاہزادی نے کہا کہ میں یہاں بہت آرام و آسائش محسوس کرتی ہوں بلکہ میں تو کہوں گی یہ جگہ

ہماری پہلی سلطنت اور راج محل سے بھی زیادہ آرام دہ ہے۔

"اب میری تمنا ہے کہ تم میرے والدِ بزرگوار اور والدۂ ماجدہ اور اُن کے درباریوں کو بُلوانے کا انتظام کر دو تاکہ وہ پُرانا شان و شکوہ اور نظم و نسق یہاں پھر سے قائم کر دیا جائے۔"

یہ جملہ سُننا تھا کہ جیسے تاؤ پر بجلی گر پڑی۔ اُس کی سمجھ میں کسی طرح نہ آتا تھا کہ بھلا یہاں پر خانوادہ شاہی اور اُس کا پورا لاؤ لشکر کیسے سمائے گا۔ تاؤ نے اشاروں اشاروں میں شاہزادی کی رائے سے اختلاف کرنا چاہا۔ اختلاف کی مجال دیکھتے ہی راجکماری کنول کے غصے کا پارہ چڑھ گیا اور اُس نے تیوری چڑھا کر کہا:۔

"وہ شخص جو میری ضرورت کے وقت کام نہ آ سکے اس قابل نہیں ہے کہ راجکماری کنول کا شوہر کہلایا جائے۔"

اتنا کہا اور راجکماری کنول کی چیخیں فضا میں بلند ہونے لگیں۔ تاؤ بدحواس ہو گیا اور راجکماری کو تسلی دینے اور ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اتنے میں اُس کی آنکھ کھُل گئی اور دیکھا تو یہ بھی خواب تھا۔

تاہم اُس کے کانوں میں بھن بھن کی صدائیں آ رہی تھیں۔ اُس نے مُنہ موڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا تو دو تین شہد کی مکھیاں اُس کے تکیے سے لپٹی ہوئی تھیں۔ ہاتھ ہلانے اور بھگانے کے باوجود وہ وہاں سے نہیں سرکیں۔

تاؤ نے اپنے دوست کو آواز دی۔ دونوں نے مل کر تلاش کیا تو پتہ چلا کہ مکان کے اندر اور اُس کے لباس پر اور کئی شہد کی مکھیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ تاؤ کو اس پر بڑی حیرت ہوئی لیکن دوست نے تاؤ کو مشورہ دیا کہ جاؤ اور مکھیوں کا چھتہ کہیں سے فوراً لے آؤ۔ چھتے کا آنا تھا کہ کمرے میں جتنی مکھیاں تھیں سب کی سب

اُس چھتے میں داخل ہو گئیں اور اُن کے علاوہ باغیچے میں اِدھر اُدھر کی اور بہت مکھیوں کا دل سِمٹ آیا اور سب کی سب اسی چھتے میں براجمان ہو گئیں۔

تاؤ اور اُس کا دوست دونوں اس سے فارغ ہو کر یہ سوچنے بیٹھے کہ شہد کی مکھیاں کہاں سے اور کیسے آ گئیں۔ تب یہ کھُلا کہ وہ ایک بڑے میاں کی پالتو مکھیاں تھیں جو وہاں سے نزدیک ہی رہتا تھا۔ اُس کے چھتے کو جب مکھیاں چھوڑ کر آ گئی تھیں توڑ کر دیکھا تو اُس کے اندر سے ایک بڑا سا سانپ نکلا۔ یہ تھا وہ شیطان دیو ہیکر جو تاؤ کے خواب میں آیا تھا۔

مگر مکھیاں پھر تاؤ کو چھوڑ کر نہیں گئیں بلکہ سال بہ سال اُن کی تعداد بڑھتی ہی چلی گئی۔

از: چانگ تیئن یی
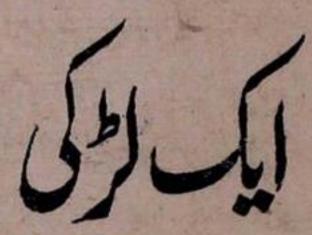
۱۹۰۷ء میں صوبہ ہونان میں پیدا ہوا اور پی پنگ یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ ایک زمانے تک چینی دیہات میں بسر کی۔ اُسے ہونان سے بڑی محبت ہے اور چینی کسانوں کی زندگی کے ہر رنگ کو پیش کرنے میں اُس کا قلم کمال رکھتا ہے۔

اب تک وہ کئی ناول لکھ چکا ہے۔ جن، بھوت، پری کی کہانیاں اور مختصر افسانوں کے مجموعے شائع کرا چکا ہے اور ممتاز چینی ادیبوں میں ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔

چانگ تیئن یی کو ۱۹۳۰ء میں شہرت حاصل ہوئی۔ کسان اور زمیندار یا ساہوکار کی کشمکش، کسانوں کی تباہ حالی، دیہات میں فوجیوں کی دست درازی، دیہات کی فصلوں، موسموں اور تیوہاروں کے طریقے یہ وہ موضوع ہیں جن پر زیادہ تر چانگ تیئن یی نے اپنی کہانیاں اور

اور ناول صرف کیئے ہیں۔

وہ عام طور سے ایک طنز نگار کہا جاتا ہے لیکن اُس کے یہاں طنز سے زیادہ دردناکی اور بے دردی کے مناظر ہیں۔ اگرچہ وہ بھی لوژدن کا مرید اور چینی ترقی پسند مصنفین کا ایک فرد ہے لیکن ایک زمانے تک اُس کی کہانیوں میں اہنسا کا پرچار اور انسانی برادری پر ترس کھانے یا ظالم کو معاف کر دینے کا جذبہ کارفرما رہا ہے۔

کہانی "ایک لڑکی" میں چانگ تیئن یی نے جہاں کسان لڑکی پر زمیندار کے مظالم، اُس کی چال بازی اور چینی کسان کی مظلومیت کا بڑا دردناک نقشہ کھینچا ہے۔ زمیندار کے حیوانی جذبے کی تہ میں ہمیں ایک فطری رُجحان جتانے کی بھی کوشش کی گئی ہے۔

ایک موقع پر اُس نے لکھا تھا کہ انسان کا جو اعصابی نظام ہے اُس میں کوئی رگ ایسی بھی ہے جو ابھی تک علم الاجسام جاننے والے پا نہیں سکے ہیں۔ یہ رگ ہے تضاد کی اور بے جوڑپن کی۔ چانگ تیئن یی کے افسانوں اور ناولوں میں مختلف کرداروں کے اندر یہ دُکھتی رگ پکڑ کر دکھائی گئی ہے۔ یہی چانگ کی تصانیف کا ایک حسن ہے اور یہی بڑا عیب کہ اُس رگ کو پکڑنے کی کوشش میں طبقاتی مفاد کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔

کسانوں میں اس خبر پر چہ میگوئیاں ہو رہی تھیں کہ جن سان کی بیوی آجکل چوانگ شی میں ہے۔

'کیوں کیا اس کا چاہنے والا آج کل وہاں رہتا ہے؟'

'ہاں ہاں ان کے ایک لڑکی بھی تو ہو گئی ہے!' کسی نے کانا پھوسی کرتے ہوئے کہا۔ کچھ اس طرح کہ اگر وہ زور سے کہے گا تو گویا بہتان تراشی کا گناہگار قرار پائے گا۔ لیکن اس کے باوجود کہنے والے کی آواز دس گز اُدھر تک گئی ہوگی۔

'مجھے تو ڈر ہے کہ وہ جن سان سے جو لڑکا بتایا جاتا ہے وہ بھی کسی اور کا ہوگا!' سب مڑ کر اس نوجوان کا منہ تکنے لگے جس کے منہ سے اتنی بڑی بات نکل گئی تھی۔ اس پر ایک دوسرے سے کہنے لگا۔ 'ایسی قیاسی باتوں کو زبان پر نہیں لانا چاہیئے۔'

'میں ایک بات کہوں تم سے مگر کسی سے ذکر نہ کرنا۔ جن سان کی برادری والے ان کو واپس لانے جا رہے ہیں!'

'مجھے حیرت ہے کہ بڑے میاں چانگ اسے کیسے برداشت کر لیں گے۔

ذرا سوچو تو خاندان بھر کو جنم دینے والی ــــــ ارے کیا بلا کی عورت ہے'

اس دوران میں بڑے میاں چانگ برادری کا مکھیا تدبیر سوچ رہا تھا۔

اُس نے ٹانگ پہ ٹانگ رکھی اور داہنے ہاتھ کی چھنگلیا سے اپنا دانت کُریدا۔ اُس کے چہرے پر چکنائی تھی جیسے موم مل رکھا ہو۔ ڈوبتے ہوئے سورج کی ایک کرن اُس کے چہرے پر پڑی تو وہ کانچ کی بوتل کی طرح چمکنے لگا۔ دل ہی دل میں اطمینان کی ایک لہر اُس پر آئی اور اُس کی ٹانگیں خود بہ خود ہلنے لگیں۔ اُس کے چوغے پر بنے ہوئے چند خربوزے کے بیج ٹانگوں کی حرکت سے اس طرح اِدھر سے اُدھر حرکت کرنے لگے جیسے طوفانی سمندر میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں ہچکولے کھاتی ہیں۔

اُس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جن سان کی بیوی جو چوانگ شی والے کے ساتھ بھاگ گئی اُس سے بھلائی کی کیا اُمید رکھی جا سکتی ہے۔ جی تو چاہتا تھا کہ اُس مرد کو بھی سزا دے لیکن مشکل یہ آ پڑی کہ چانگ کا حکم اس برادری سے باہر نہیں چلتا تھا۔

وہ اپنا دانت اور زور سے کُریدنے لگا گویا وہ انھیں جتانا چاہتا ہے کہ دیکھو قانون میرے ہاتھ میں ہے۔ ناخن کے دانت سے رگڑ کھانے کی آواز ہوئی اور اُس نے محسوس کیا کہ رال ٹپک ٹپک کر اُس کی ہتھیلی تک پہنچ گئی ہے۔

اوع —— وہ چوانگ شی والا تو معمولی سا کسان تھا۔ تعجب کی بات ہے کہ جن سانگ کی بیوی کو اُس سے محبت کیسے ہو گئی! یہ سوچتے ہوئے چانگ پر حیرت کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ ایک کے اُوپر ایک رکھی ہوئی دونوں ٹانگیں اور زور سے ہلنے لگیں۔ خربوزے کے بیجوں کا جو کباڑ اُس کے چوغے کے دامن پر اتنی دیر سے سنبھلا ہوا تھا جھٹکا کھا کر نیچے زمین پر گر گیا۔

اچھا وہ ذرا ہاتھ لگ جائے تو اتنا پیٹوں گا کہ کمر کی کھال اُدھڑ جائے۔

کمر کی کھال اُدھڑ جانے کے تصوّر سے اُس کے سارے بدن میں جُھرجُھری سی آ ئی۔
جن سان کی بیوی کی پیٹھ اتنی مضبوط نہیں ہے کہ کوڑوں کی تاب لا سکے۔
اُس کے بدن کا گوشت اس قدر نرم اور نازک ــــ توبہ توبہ ــــ اُسے گوشت کہنا ہی بے جا ہے۔ وہ تو بالکل حلوا ہے بلکہ مکھن ہے کہ ذرا یوں ہی ہاتھ لگا دو تو خراب ہو جائے۔

چانگ نے آہِ سرد بھری۔ واقعی جن سان کی بیوی کا بدن کوڑوں کی مار برداشت نہیں کر سکتا۔ اچھا تو اُس کے گال سہی مگر گال، اُسے گالوں کی نزاکت کا بھی احساس تھا کیونکہ وہ اُنھیں پہلے کبھی نوچ چکا تھا۔ دُھوپ، بارش اور ہوا کے جھونکوں کا سامنا کرتے رہنے کے باوجود اس عورت کا چہرہ ابھی تک نرم و نازک تھا۔ اُسے حیرت ہونے لگی کہ جب کمر اور گالوں کی نزاکت کا عالم یہ ہے تو اس عورت کے جسم کے دوسرے حصّوں کی کیا کیفیت ہو گی۔

وہ جن سان کی بیوی کی تعریف اور خوشامد کر چکا تھا مگر وہ اس خوشامد یا تعریف سے پگھلتی نہیں تھی۔ وہ اپنی سیاہ چمکتی ہوئی آنکھوں سے اُسے دیکھ کر چلّا کر کہتی "کیا مطلب؟"

"بس اب بہت پاکیزہ عورت بننے کی کوشش مت کرو" چانگ نے اُس سے کہا تھا۔ "مجھے خُوب معلوم ہے کہ جن سان سے تمہاری تسکین نہیں ہوتی"

اُس نے ایک بار اپنا داہنا ہاتھ اُس کے سینے کی جانب بڑھا دیا تھا۔ وہی ہاتھ جس میں لمبے لمبے ناخُن ہیں۔ مگر وہ بھی ضد کی پکّی تھی۔ اُس نے چانگ کا ہاتھ فوراً جھٹک دیا۔

"اُفوہ تمہاری یہ جُرأت اور وہ بھی دن دہاڑے؟" جن سان کی بیوی نے تڑسے جواب دیا تھا۔

"اچھا تو دن دہاڑے نہ سہی تو رات ہی کو سہی۔ جن سان کا کیا ہے وہ تو بہت کمزور اور بے جان سا آدمی ہے۔ ہے نا؟ آؤ تمہیں ......"

"جاؤ۔ جاؤ۔ نکلو یہاں سے" عورت نے جواب دیا۔

وہ اس پر بہت ناراض ہوا تھا۔

"کیا کہا تو نے؟"

"میں نے کہا کہ تم اپنے نکھیا پن سے یہ کام مت لو"

"زرا پھر دُہرانا وہی جملہ"

وہ اُس کی طرف لپکا مگر عورت کے پیچھے دوڑنے سے پہلے اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی کہ کوئی ہے تو نہیں۔ کوئی نہیں تھا، صرف ایک کُتا تھا جو راج بہے کے کنارے کنارے کودتا چلا جارہا تھا اور گیلی مٹی میں اُس کے پیروں کے نشان کنیر کے پھولوں کی طرح نشان چھوڑتے چلے جارہے تھے۔ چانگ کو یقین تھا کہ کتا کچھ نہیں بولے گا۔ وہ بے تاب تھا کہ اُس عورت کو اپنے بازوؤں میں بھینچ لے۔ اُس کے ہونٹوں کو اپنے دانتوں سے کاٹے۔ زندگی بھر کا مزا آجائے گا۔ اُسے کھا جائے زندہ۔ گلاب کے سے لال لال گلے۔ چانگ کی آنکھوں میں خون کے ڈورے دوڑنے لگے اور ماتھے پر نیلی نیلی رگیں اُبھر آئیں۔

وہ اتنے میں اُس سے دُور ہٹ گئی اور اُسے اُونچی آواز سے بُرے بُرے کوسنے دینے لگی مگر چانگ نے ایک نہیں سُنا۔

"میری پیاری۔ بگڑتی کیوں ہو۔ سُنو تو سہی۔ جو تم مانگو گی دوں گا۔ مگر بس مجھے زرا......"

"چلے جاؤ جانور کہیں کے۔ تم بوڑی برادری کے مکھیا ہو نا۔ تم کیا مکھیا پن کروگے جب بہو بیٹیوں کے ساتھ تمہارا یہ برتاؤ ہے۔ شرم نہیں آتی تمہیں اپنی

حرکت پر؟......"

اُسے پہلے سے بھی زیادہ طیش آگیا" بس اتنا مت اکڑ عورت دیکھ میں تیری حیثیت بنا دوں گا۔ تجھے برادری میں اپنے برابر کا درجہ دے دوں گا۔ تو جانتی ہے میں کون ہوں۔ میری نیت تو اچھی ہے اور پھر......"

"مجھے تمہاری اچھی نیت نہیں چاہیئے۔ تم سمجھتے ہو گے کہ دن دہاڑے جس عورت کو چاہو اس طرح قبضہ کر سکتے ہو۔"

"ذرا پھر کہنا یہی"

"میں کوئی تم سے ڈرتی ہوں۔ تم ہمیشہ سے جانور کے جانور ہو۔ تم نے ہمیشہ جن برادری کو دھوکا دیا ہے۔ پوری برادری کی شامتِ اعمال ہو تم"

"اوہ اُس نے منہ بنا کر کہا۔ اُس کے ہاتھوں کی اُنگلیاں غصے سے تھرّانے لگیں۔ ذرا ہوش میں آ لڑکی۔ تو کیا اُول فُول بک رہی ہے۔"

"مجھے کیوں ڈر لگے گا۔ میں پوری برادری کو خبر کر دوں گی کہ یہ مُکھیا جی مجھے ورغلانے کی ترکیبیں کر رہے تھے۔"

اُفوہ خُدایا۔ یہ عورت تو بڑی نٹ کھٹ نکلی" چانگ نے اپنے جی میں کہا۔

اُس نوعمر شادی شدہ عورت سے بگڑ جانا تو آسان تھا مگر جب اُس کے لال لال گالوں پر نظر پڑی، کیسے گال کہ حلوے سے زیادہ نرم اور گدُگدے اور مکھن سے زیادہ چکنے، تو پھر بات کچھ اور ہو گئی۔ اُس کے بھرے بھرے چھوٹے اور سُرخ سُرخ ہونٹ کہ کُھلتے ہی اُن میں سے سفید سفید ہموار دانتوں کی دو قطاریں جھانکتی تھیں۔

وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اب کیا کروں۔ اُس پر دباؤ تو ڈالا نہیں جا سکتا۔ اگر اور دباؤ ڈالا یا زبردستی کی تو وہ برادری میں ایک آدمی سے کہہ ڈالے گی کہ

یہ کھیا چانگ مجھے ورغلا رہا تھا۔ خیر ذرا صبر و شکون سے کام لیا جائے۔ یہ معاملہ تو صرف عورت کی طینت اور اُس کے مزاج کا ہے۔ زبان سے کہتی کچھ ہیں اور مطلب اُس کا کچھ اور ہوتا ہے۔ اُس کے نوجوان عاشق کو ہی دیکھ لو۔ کیا وہ اُس سے رضامند نہیں ہو گئی تھی۔ عورتیں بس ایسی ہی ہوتی ہیں۔ جن سان کی بیوی بھی ہمیشہ کے لئے اُس سے بگڑی نہیں رہے گی۔

دوسرے دن وہ بڑی شوخ رنگ چوڑیاں لے کر آیا اور سید عارج ہے کی طرف چلا۔ سُورج غروب ہو رہا تھا۔ جن سان کی بیوی رات کے کھانے کے لئے چاول صاف کر رہی تھی۔

"کہو کیا ہو رہا ہے؟"

عورت نے جواب نہیں دیا۔

"کیا اب بھی مجھ سے ناراض ہو؟" وہ مُسکرایا۔ "اب بھی تم ایسے بن رہی ہو جیسے بہت بھولی معصوم بچّی؟ اوہو ذرا اسے تو دیکھو۔"

اُس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا اور اپنے چاول پھٹکتی رہی۔

"گردن بھی نہیں موڑی جاتی تم سے۔" اس نے یہ جملہ ایسے ادا کیا جیسے کوئی ایکٹر ڈرامائی انداز کے ساتھ ادا کرتا ہے اور اُسی کی طرح سر گھمایا۔ سر گھمانے میں اُس نے چوڑی والے ہاتھ کو ایسی حرکت دی کہ شام کی شفق آلود شام میں ایک دائرہ کی شکل بنا دی مگر عورت اس پر بھی متوجہ نہ ہوئی۔

اس پر چانگ کا جی جل گیا۔ وہ ہر چیز کو جوں کے توں برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اُس کا داہنا ہاتھ جس سے کبھی جن سان کی بیوی کے کلّے نوچے تھے عجیب قسم کی سنسنی کے ساتھ لرز گیا۔ اس لرزش میں نہ تو کوئی درد یا دُکھن تھی اور نہ سُن ہو جانے کی سی کیفیت۔ ان دونوں سے الگ کوئی اور ہی بات تھی۔ اُس کے

ذہن میں کلّے نوچنے کی پوری کیفیت تازہ ہو گئی۔ جب اُس نے نوچا تھا تو چٹکی کے نشان سے سفید دھبّہ اُس کے گال پر پڑ گیا تھا اور دھیرے دھیرے خون کی سُرخی واپس آئی تھی۔

کچھ ہی عرصہ ہوا جب یہ واقعہ پیش آیا تھا مگر اس کے باوجود وہ اُسکے قابو میں نہیں آئی۔ اس کے بعد فوراً ہی وہ اپنے عاشق کی آغوش میں پہنچ گئی تھی۔

"اوع   اُسے میری محبت اور میری چاہت کی ذرا بھی پروا نہیں ہے۔ اچھی بات ہے ذرا ہاتھ آجائے پھر ایسے کوڑے برساؤں گا کہ   "

پھر ایک دن اُس کی ساس آئی بڑی بی ژیانگ اور اُس نے خبر دی کہ جن سان کی دلہن تو جوانگ شی بھاگ گئی۔ بڑی بی خوف اور اضطراب کے مارے کانپ رہی تھی کیونکہ اُس کے بیٹے جن سان نے مکھیا کو ابھی تک وہ رقم ادا نہیں کی تھی جو وہ قرض لے چکا تھا۔

"اب میں کیا کروں؟" بڑی بی نے درد بھری آواز میں پوچھا۔

"کردگی کیا جاؤ۔ اُس عورت کو واپس لے کر آؤ" ایسے زور سے اُس نے چیخ کر اور میز پر گھونسہ مار کر یہ جملہ کہا کہ ہاتھ سُرخ ہو گیا۔ "فرار ہو گئی" بدمعاشی سُنا تو نے فرار ہو گئی۔ ساری برادری کے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکا لگا گئی۔ جاؤ اسے واپس لے کر آؤ۔ میں بتاؤں گا کہ برادری کا قاعدہ کسے کہتے ہیں۔ میں اُسے دکھا دوں گا۔"

(۲)

کچھ روز بعد جب وہ لڑکی واپس لائی جا چکی تو اُس کی ساس نے برادری کے آبا و اجداد کے پرانے مندر میں سب بڑوں بڑوں کو جمع کیا۔ اس پنچایت میں صرف برادریوں کے مکھیا اور خود اس خاندان کے لوگ اور اُن کے علاوہ جن سان

کے سمدھی بُلائے گئے تھے۔ بڑے میاں چانگ بھی حسبِ دستور موجود تھے۔ وہ مُسلسل اپنا دانت کُریدے جارہا تھا۔ مُنہ بنا رہا تھا اور بار بار اپنے دل میں کہتا تھا کہ بُہتر تو یہی ہے کہ اُسے دیس نکالا نہ دیا جائے۔ یہیں روک لیا جائے مگر ہاں سزا ضرور ملے۔ سزا ملے تو بات ہے۔

برادری کے مکھیا کی حیثیت سے اُسے یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ جن سان کو اپنے سامنے طلب کرے۔

"بتاؤ، تم اب بھی اس عورت کو رکھنے کے لئے تیار ہو گیا؟" اُس نے جن سان سے سوال کیا اور جواب کا انتظار کئے بغیر خود ہی بولتا چلا گیا "میرا خیال ہے کہ اسے بھاگ جانے کی سزا ضرور ملنی چاہیئے۔ اسے ایسا سبق ملنا چاہیئے تاکہ آئندہ وہ ٹھیک چلے۔ بولو کیا کہتے ہو؟ اگر ہم اسے برادری سے خارج کر دیتے ہیں تو مجھے پکّا یقین ہے کہ سب لوگوں میں یہ خبر پھیل جائے گی اور جن برادری کی ناک دُنیا بھر کے سامنے کٹ جائے گی۔ کچھ بھی ہو لیکن ہے تو وہ جن والوں کی بہو۔ میری رائے میں تو بس اسے سزا دی جائے اور آئندہ اپنا چال چلن دُرست رکھنے کی سخت تاکید کر دی جائے۔"

جن سان کی سمجھ میں نہ آیا کہ خود کیا کہے۔ وہ گو مگو کے عالم میں تھا۔ اُس کی سمجھ اور زبان دونوں پر مُہر لگی ہوئی تھی۔ ایک بات اُسے معلوم تھی کہ برادری کے مکھیا نے جو بات کہہ دی ہے ماننی وہی پڑے گی اور اُسی کو مان لینا چاہیئے کیونکہ مکھیا نے ہمیشہ اُس سے بھلا برتاؤ کیا تھا۔ صرف بھلا برتاؤ نہیں بلکہ ایک سو چالیس ڈالر بھی قرض دے تھے۔

"بولو کیا کہتے ہو تم؟" چانگ نے جن سان کو ٹھوکا دیتے ہوئے زور سے پوچھا اور اُس کی آنکھوں میں اپنی سوالیہ آنکھیں ڈال دیں۔

"اگر ہم نے اسے برادری سے نکال باہر کیا تو سب کو خبر ہو جائے گی اور جن والوں کا نام دُنیا بھر میں بدنام ہو جائے گا۔ تم چاہو تو ایسا کرو مگر میں اس حق میں نہیں ہوں۔"

غرض فیصلہ ہوا کہ عورت کو اُس کے کئے کی سزا دی جائے۔ بزرگوں کے مندر میں برادری کے مکھیاؤں اور بڑے بوڑھوں کے سامنے اُسے بلا کر فیصلہ سُنا دیا جائے۔

اس نتیجے پر پہنچ جانے کے بعد بزرگوں کے مندر میں اُوپر تلے رکھے ہوئے تمام چھوٹے چھوٹے صندوق کھولے گئے۔ لکڑی کے نقشین ٹکڑے اُن میں سے نکالے گئے جن پر سُنہرے حرفوں میں بزرگوں کے نام لکھے ہوئے تھے کیونکہ یہ فرائض میں شامل تھا کہ ان تمام بزرگوں کو خبر دی جائے کہ فلاں فلاں نے ایسی حرکت کر کے برادری کا نام بدنام کیا ہے۔ میز پر ایک طشت رکھا ہوا تھا اور طشت میں کارچوبی ریشم کا ایک ٹکڑا تھا۔ جب ہوا کا جھونکا کمرے سے گزرتا تو ریشم کا یہ ٹکڑا اضطراب کے ساتھ تھپ تھپ کرنے لگتا۔ بڑی میز کے نیچے زنجیریں، رسّے اور ٹوٹے پھوٹے بانس وغیرہ کا ایک ڈھیر اکٹھا پڑا تھا۔

کئی بار چانگ کا جی تلملایا کہ وہ اپنا دانت زور سے کھینچ لے لیکن ہر بار اس نے ضبط سے کام لیا۔ چڑھی ہوئی آنکھوں سے اُس نے برادری کے بڈھے بوڑھوں کو جو سامنے بیٹھے تھے نہایت غور سے دیکھا۔ اس کے بعد چانگ کی نگاہیں جن سان کے رشتہ داروں کی طرف واپس مڑ گئیں جو ایک قطار کی شکل میں بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے چہروں پر مختلف قسم کے احساسات تیر رہے تھے۔ سب کے بعد میں چانگ کی نظر وہاں ٹھہری جہاں وہ کھڑی تھی۔ وہ اپنی ساس کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ اُس کا سایہ دیوار پر چڑھ جانے کی وجہ سے ۲ حصّوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ پھر

اِدھر اُدھر نظر ڈالی اور پھر اُسی کی طرف موڑ دی۔ اُسے دیکھ کر چانگ نے جن سان کی بیوی کو دیکھا۔ آپ سے آپ چانگ کا داہنا ہاتھ دانت کی طرف گیا لیکن اپنی اس حرکت کا جیسے ہی اسے احساس ہوا فوراً اُس نے ہاتھ کھینچ لیا اور اُسے پھر آستین میں ڈال لیا۔ اب ہر شخص دزدیدہ نظروں سے اُسی لڑکی کو دیکھے جا رہا تھا۔ جن سان کے جو قریبی رشتہ دار تھے وہ خاص طور سے دبی چھپی نظریں اُس کے چہرے پر ڈال لیتے تھے مگر بار بار نہیں کیونکہ انھیں چانگ کا اندیشہ تھا کہ کہیں وہ نہ تاڑ جائے۔

لڑکی کے چہرے سے کوئی بات ظاہر نہیں ہوتی تھی۔ وہ مُسلسل اپنے ہونٹ کاٹے جا رہی تھی۔ پہلے کے مقابلے میں اُس کا رنگ ذرا پیلا پڑ چکا تھا اور وہ کچھ جھجک بھی گئی تھی مگر مضبوط اور چاق چوبند اب بھی نظر آتی تھی۔ اب اُس نے زمین پر آنکھیں جمالیں جیسے وہ طے کر چکی ہے کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔

آخر میں اُس کی بوڑھی ساس اُٹھی اور اُس نے بہو کے تمام جرائم ایک ایک کر کے گنوانے شروع کیے۔ اُس وقت تک جبکہ وہ گرفتار کی گئی ساس، نے بہو کے تمام گناہ گنوانے کے بعد بنچوں سے درخواست کی کہ اب وہ آبا و اجداد کے سامنے اپنے فیصلے کا اعلان کریں۔

ہر شخص کی نگاہیں بڑے میاں چانگ کی طرف اُٹھ گئیں لیکن لڑکی کی نظر جہاں تھی وہیں رہی۔

چانگ نے فیصلہ سُنانا شروع کیا۔ بڑی بی نے ایک ایک ذرہ حالات ہمیں سُنا دیئے ہیں۔ ملزمہ کے والدین بھی اس وقت موجود ہیں۔ اب آپ پنگ (لڑکی کے والدین) کے سوچنے اور طے کر دینے کی بات رہ جاتی ہے کہ آیا آپ اپنی بیٹی کو سزا دلوانے کے لیئے تیار ہیں؟"

یہ سُننا تھا کہ لڑکی کی ماں بولی "جب میری بیٹی نے قصور کیا ہے تو میں اسے سزا دلوانے کے لئے بالکل تیار ہوں۔ سزا ملنی ہی چاہیئے"

"بہت بہتر، میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ لوگ بہت سمجھدار ہیں۔ آپ اپنی لڑکی کو سزا دلوائے بغیر راضی..... خیر۔ میں اس سے بھی پوچھ لوں۔ مجھے سوال کرنے....." چانگ کا داہنا ہاتھ فوراً دانت کی جانب بے اختیار بڑھا۔ "یہاں آؤ" اس نے جن سان کی بیوی سے چلا کر کہا "تمہیں کچھ اپنی صفائی میں کہنا ہے؟"

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔

"مجھے جواب دو"

پھر خاموشی۔

"بول نا ــــ میرے سوال کا جواب دے" تھوڑی دیر چُپ رہ کر پھر اُس نے پوچھا "تو اتنی چُپ کیوں ہے؟ بولتی کیوں نہیں؟"

"مجھے کچھ نہیں کہنا ہے" اُس نے ہنہناتے ہوئے کہا جیسے وہ کوئی پتھر ہے۔ پتھر کے اس جواب پر ہر شخص حیرت زدہ رہ گیا۔

"خیر اگر تو اپنے گناہوں کا اقرار نہیں کرتی تو کوئی بات نہیں۔ مجھے سب معلوم ہے" چانگ نے چڑچڑے پن کی چیخ کے ساتھ کہا۔ "میں کیا ہر شخص کو خبر ہے۔ سُن رہی ہے تو، ہر آدمی کو سب معلوم ہے۔ اب ہمیں تیرے والدین کی طرف سے بھی اجازت مل گئی ہے تجھے سزا دینے کی۔ ہماری عزیز بہن ینگ (لڑکی کی ماں) بھی اس پر رضا مند ہیں..... اچھا تو اب ہم اسی کو طے کریں گے"

وہ ایک طرف جھکا اور اُس نے برادری کے دوسرے مکھیا کے کان میں آہستہ آہستہ کوئی بات کہی۔

ہر شخص سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور دم بخود ہو گیا۔ پُورے مجمع کی نظر اب یوں

مکھیاؤں کی طرف لگی تھی جو چپکے چپکے ایک دوسرے کے کان میں مشورہ کر رہے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ آپ میں سے ہر آدمی پورے واقعے کو اچھی طرح سے سمجھ گیا ہے" چانگ نے بالآخر کہا۔ یہ کہتے وقت اُس نے آستین سے اپنے ہاتھ نکال لئے اور تن کر بیٹھ گیا۔ یہ بات تو پکی ہے کہ جو قصور اُس سے ہوا وہ ایسا ذلیل ہے کہ معاف نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے بزرگوں کے نام کو اس نے بٹہ لگا دیا ہے۔ میں برادری کا مکھیا ہوں اور میرا فرض ہے کہ آج کل جو گندے رواج اور فیشن چل رہے ہیں انھیں اپنے یہاں نہ چلنے دوں۔ اس لڑکی کو ایسی سزا دی جائے جو ان لوگوں کے لئے عبرت بن جائے جو گندے اور بیہودہ فیشن پر چل رہے ہیں اور اخلاق کا سبق بھلا چکے ہیں۔ لوگوں میں سے عصمت، عفّت، پاکدامنی اُڑ گئی ہے۔ برادرانہ محبت غائب ہو گئی ہے۔ وفاداری اور ایمانداری، راست بازی اور شرم و حیا کا جذبہ جاتا رہا ہے۔ آنکھوں کا پانی مر گیا ہے۔ یہ حالت ایسی ہے کہ اسے کسی طرح برداشت نہ کرنا چاہیئے۔ لوگوں کو کھلی چھٹی دے دینا اور بے لگام چھوڑ دینا تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ ساری برائیوں کی جڑ۔ کبھی برداشت نہیں ہو سکتا۔ پورے جن خاندان کی نیک نامی پر پانی پھر گیا ہے۔ اسے ایسی سزا ملنی چاہیئے کہ دوسرے اسے دیکھ کر کان پکڑیں۔ "گھٹنوں کے بل جھک جاؤ" یہ حکم صادر کرتے ہوئے اُس نے میز پر زور سے گھونسہ مارا۔ میز پر رکھے ہوئے طشت کا لال ریشمی کپڑا تھر تھرانے لگا۔ وہ حکم جاری کرتا رہا۔

"جن سان اُٹھ۔ اس کے کپڑے اُتار اور سو بار اس کے چوٹ پڑنی چاہیئے"

جن سان کو بہ نظر غور دیکھنے لگا جو اُس کے اوپر والے کپڑے اتار رہا تھا۔ اس وقت چانگ کو خیال آیا کہ لڑکی کے عاشق نے چوانگ شی میں اسی طرح اس کے کپڑے اُتارے ہوں گے اور پھر اپنی آغوش میں لیا ہوگا۔ اس کے چہرے کا رنگ

فق ہو گیا مگر اُسے اُمید تھی کہ جن سان اُس کے "چھوٹے کپڑے" اُتارنے کی ہمت نہیں کرے گا۔

اب لڑکی کے جسم پر لے دے کر صرف ایک بلاؤز اور اندر کا پاجامہ رہ گیا تھا جو موٹے کپڑے کا بنا ہوا تھا۔ اُس کا سینہ بلاؤز میں سے باہر کی طرف نکلا ہوا تھا۔ اگرچہ پستانوں کی گھنڈیاں محرم کے اندر تھیں لیکن پھر بھی اتنی اُبھری ہوئی تھیں کہ صاف نظر آ رہی تھیں۔ نہ جانے کتنی بار اُس کے عاشق نے سینے کے اسی مقام کو اپنے ہاتھوں سے سہلایا ہوگا۔ جب جن سان نے اُس کے باہر والے کپڑے کو اُتارا اُس وقت چاندی کے سکّے کی جھنکار اُسے سُنائی دی۔ ۔۔۔۔۔

وہ زمین پر اس طرح رُکوع میں جھک گئی کہ اُس کا منہ مکھیا کی گدّی کی طرف ہو گیا۔ اُس کے ہاتھ ماں اور ساس دونوں نے مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے۔ جن سان نے ہتھیلیوں پر تھوک لگایا اور میز کے نیچے پڑے ہوئے بانس میں سے ایک کھپچی اُٹھالی۔

"شاباش" شوہر نے زور سے اُس کی کمر پر کھپچی کا ایک ہاتھ جمایا اور پھر دوسرا ہاتھ۔

جن سان نے دانت بھینچ لئے۔ بازوؤں کی مچھلیاں باہر تڑپنے لگیں۔ تیسری چوٹ، چوتھی اور یہ پانچویں۔ تیزی کے ساتھ تڑاتڑ کوڑا پڑنے لگا۔

بانس کے پھٹے ہوئے ریشے اُدھڑنے لگے۔ درمیان میں صرف سخت لکڑی باقی رہ گئی۔

کسی کو خبر نہ تھی کہ اُس کی بیوی کے حلوے جیسے گداز گوشت پر کیا گزر رہی ہے کیونکہ گوشت تو بلاؤز کے پردے میں پوشیدہ تھا۔ صرف بانس کی فولادی سختی کو دیکھ کر ایک اندازہ ہو سکتا تھا کہ لڑکی کے بدن کا کیا سے کیا حال ہو گیا ہوگا اور یہ دیکھ کر کہ ہر ایک چوٹ پر جن سان کے ہاتھ کی تیزی بڑھتی جا رہی تھی اور ہر بار بانس بھنا جاتا تھا لڑکی کی اندرونی حالت کا تصور کیا جا سکتا تھا۔ جس جگہ چوٹ پڑ رہی ہے

وہاں کا سفید گوشت ورم کر گیا ہو گا، مار کھا کھا کر سُرخ ہو گیا ہو گا اور قمچیوں کے نیل پڑ گئے ہوں گے۔ جب اور مار پڑے گی تو سُوجے ہوئے بدن سے خُون رَواں ہو جائے گا اور سفید بلاؤز پر خون کے چھینٹے اُبھر آئیں گے۔

اُس نے آہ تک نہ کی۔ وہ مضبوطی سے اپنے دانت بھینچے رہی۔ یہاں تک کہ وہ دُکھنے لگے۔ اُس نے بچاؤ کی بھی کوشش نہ کی بلکہ جب اُس کی کمر پر چوٹ پڑتی تھی خود بخود اُس کا بدن لرز جاتا تھا۔ اُس کے ہاتھ ماں اور ساس کے ہاتھوں میں بالکل قید تھے۔ وہ ادھر سے اُدھر حرکت نہ کر سکتی تھی۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں کہ کہیں اُن سے درد کا احساس نہ ٹپک پڑے۔ آنکھ کے ایک گوشے سے آنسو کا قطرہ ٹپکا۔ جیسے ہی جن سان بانس کا کوڑا مارنے کے لئے اُٹھاتا تھا وہ التجا کرتی تھی، یہ نہیں کہ ذرا آہستہ مارو بلکہ یہ کہ جہاں زخم کھل گیا ہے اُس جگہ کو بچا کر مارو مگر اس التجا کا بھی جواب نہ ملتا تھا۔ گوشت پر جہاں زخم یا خراش کے نشان نہ تھے جلاّد نے وہاں بھی کوڑے برساتے برساتے بدن سُجا دیا اور جہاں وہ سُوج گیا تھا وہاں مارتے مارتے خُون رواں کر دیا۔

سفید رنگ کے ہلکے کپڑے کا بلاؤز خون میں تر بتر ہو گیا۔ ہرے رنگ کے بانس پر بھی خون کے لال دھبے پڑ گئے۔

۹۹—۱۰۰

جن سان ہانپ گیا تھا۔ وہ سانس لینے لگا اور ماتھے کا پسینہ اپنی آستین سے پونچھنے لگا۔ چانگ کا جبڑا اینٹھن کے ساتھ حرکت میں آیا۔

"بتاؤ۔ اب پھر چانگ شی بھاگنا چاہتی ہو؟" اُس نے بالکل غیر فطری آواز میں سوال کیا۔ ہر شخص کی نظر جن سان کی بیوی کے چہرے پر گڑ گئی۔ وہ اُلٹے سانس لے رہی تھی اور آنکھیں اُس نے بند کر رکھی تھیں۔

"جواب کیوں نہیں دیتی؟" ماں نے پوچھا۔

"اب تو اپنے کیے پر توبہ کرلے" چانگ مسکرایا۔

"میں — م"

ٹوٹا ہوا ایک حرف اُس کی زبان سے نکلا۔ پورا مجمع سانس روکے ہوئے اس کی آواز سننے کے لیے بے چین تھا۔

"کچھ بھی ہو — میں چوانگ شی جاؤں گی۔"

اُس کی آواز بہت دھیمی اور نقاہت سے چور تھی مگر اسی آواز نے جو جملہ کہا وہ ایسا لگا جیسے کوئی کان پھٹ گئی۔ سب لوگ ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ آنکھیں پھٹی رہ گئیں جیسے سب کے سب بھونچکے ہو گئے ہوں۔

چانگ کے ماتھے پر نیلی رگیں اُبھر آئیں اور چہرے پر غبار کی ایک تہ چڑھ گئی۔ قطامہ کہیں کی۔ وہ خود ہی چاہتی ہے کہ اُس کا جو وہ گھٹیا کسان عاشق ہے اسیطرح اپنی آغوش میں دبوچتا رہے۔ بے وفا ناشکری عورت۔ اُس نے بے پروائی سے میز پر گھونسا مارا اور اپنی آواز کی پوری قوت سے چلایا۔ گویا اس کے سینے میں جتنا غیظ و غضب ہے اُس کو یہ بیک آواز باہر اُگل دینا چاہتا ہے

"پیٹو۔ اسے اور پیٹو"

لڑکی نے اپنا سر جھکا دیا اور اب جو اُس پر چوٹ پڑنی شروع ہوئی تو سارا بدن ایک اینٹھن اور تشنج کی سی کیفیت کے ساتھ تڑپنے لگا۔ ایک دم وہ بے ہوش ہو گئی۔ لوگ دوڑے اور اُس پر ٹھنڈا پانی چھڑکنے لگے۔

"اب جو ہوش میں آئے تو اسے اور پیٹو" چانگ غصے سے چلایا۔

اُس کے بلاؤز اور پاجامے دونوں پر خون کے دھبے پڑ گئے تھے۔ ماں کے ہاتھ کانپنے لگے تھے اور آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی تھی۔

"سوال کا جواب دے۔ کیا پھر چوانگ شی جائے گی تو؟"

مگر اس سوال کا کوئی جواب نہ ملا۔

ماں اپنی بیٹی سے التجا کرنے لگی۔ آنسوؤں کی قطار اُس کی آنکھوں سے رواں تھی۔" رحم کر۔ کہہ دے نہیں جاؤں گی۔ بس کر۔ کہہ دے اب نہیں جاؤں گی....."

بیٹی نے اشک آلود آنکھوں سے ماں کو دیکھا اور صرف اتنا کہا" ماں۔ گھبرا نہیں۔ میں۔ میں جاؤں گی....."

چانگ کو ایسا محسوس ہوا کہ اُس کے پھیپھڑے پھٹ جائیں گے اور وہ بھرائی ہوئی اور پھٹی ہوئی آواز میں زور سے چیخا" اسے اور مارو۔ اور پیٹو"

لڑکی پھر بے ہوش ہوگئی مگر اُس نے اُف تک نہ کی۔ اپنے بدن پر خون کے فوارے چلتے دیکھے اور حرفِ شکایت زبان پر نہ لائی اور نہ وہ الفاظ کہے جو اُس سے کہلوائے جارہے تھے۔ اُسے اُمید تھی کہ اس طرح سے وہ تمام لوگ اُس سے ناراض ہوجائیں گے اور برادری سے نکال باہر کریں گے۔ چانگ خوب سمجھتا تھا کہ وہ کیا سوچے ہوئے ہے۔ اسی لیے چانگ نے لڑکی کو ذات باہر کرنے اور دیس نکالا دینے کے متعلق ایک لفظ نہیں کہا۔ اُس کی رائے میں بس یہی تدبیر تھی کہ اُسے پیٹتے پیٹتے اتنا بے حال کر دیا جائے کہ اُس کے سر میں جو سودا سمایا ہے وہ جاتا رہے۔

" بتا اب بھی جوانگ شی جائے گی تو؟" چانگ نے زور سے چیخ کر پوچھا۔ ایسے کہ مُنہ سے جھاگ اُڑے"۔ اسے پیٹے جاؤ۔ جب تک یہ توبہ نہ کرلے"

اب اس کے بدن پر گوشت کی بوٹی نہ رہ گئی تھی۔ بلاؤز اور پاجامہ دونوں خون میں تر ہو چکے تھے۔ چھ بار اس پر مار پڑی اور چھ بار وہ مار کھاتے کھاتے بے ہوش ہوئی۔ آبا و اجداد کے اس قدیم مندر میں اس وقت جتنے لوگ جمع تھے سب نے دہشت کے مارے اپنی آنکھیں بند کرلی تھیں کیونکہ وہ اس دردناک منظر کی تاب نہ لا سکتے تھے۔ کئی آدمیوں نے تو چُپکے چُپکے آنکھوں سے آنسو بھی پونچھے۔ لڑکی

کے باپ نے اپنا مُنہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا تھا۔ماں آہیں بھر رہی تھی اور چیخ چیخ کر رو رہی تھی۔ساس کی آنکھیں بھی نم تھیں۔ وہ نم آنکھوں کو جھپکاتی اور اپنا سر ہلاتی جاتی۔جن سان کے ہاتھ تھر تھرا رہے تھے۔اب اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ بانس کی کھپچی اُٹھا بھی سکے۔

"اچھا۔ تو اب؟" یہ دو لفظ چانگ نے ایسی آواز میں کہے جس آواز کو وہ پہچان سکتا تھا کہ خود اُسی کی ہے۔

لڑکی نے آنکھیں آدھی آدھی کھولیں۔

"ہاں..... ہاں۔ میں چوانگ شی جاؤں گی....."

چانگ کو ایسا طیش آیا کہ بس چلتا تو ساری دُنیا کو جلا کر بھسم کر دیتا۔وہ اپنی جگہ سے اُچھلا اور اُس نے میز پر مُکّہ مارا۔

"پیٹو۔ اسے پیٹو" وہ بے اختیار چلّایا۔"جن سان کیا دیکھتا ہے۔اسے پیٹتا کیوں نہیں۔؟"

جن سان کے ہاتھ لرز کر رہ گئے۔ وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔

"پیٹو اسے"

لڑکی کی ماں دھاڑ مار کر گھٹنوں کے بل مکھیا چانگ کے قدموں پر گر پڑی۔

"میری بچّی کو معاف کر دو....."

اب برادری کا دوسرا مکھیا اُٹھا اور اُس نے صاف صاف کہہ دیا کہ لڑکی پر اب ہاتھ اُٹھانا بالکل ناممکن ہے۔

"اچھا تو اسے کوٹھری میں بند کر دو" چانگ نے کہا۔

پُورے مجمع نے اطمینان کا لمبا سانس لیا۔

(۳)

کھیتوں میں درختوں پر سے پتّوں کی پوشاک اُتر چکی تھی۔ پہاڑیاں اور ٹیلے ایسے نظر آتے تھے جیسے پیلی مٹّی کے پشتارے۔ ہوا میں ٹھر پیدا ہو گئی تھی۔

اس موسم میں چانگ کو جن سان کی بیوی سے ہمدردی کا خیال آیا۔ ان دنوں جب کبھی جن سان سے اس کا آمنا سامنا ہو جاتا تھا تو وہ پوچھتا تھا۔

"کہو گھر والی خیریت سے ہے؟"

"ہاں کہنا تو مانتی ہے مگر زبان سے کچھ نہیں بولتی"

"ذرا ہوشیار رہنا۔ اب کے کہیں نہ چل دے"

"جی حضور۔ ایسا نظر تو نہیں آتا"

"وہ جو اُس کی ناجائز لڑکی تھی اُس کا کیا ہوا؟"

"میری ساس لے گئی تھی اُسے تو چوانگ شی میں اس کے باپ کے حوالے کرنے"

جن سان کی بیوی کے لبوں پر خاموشی کی مُہر لگ گئی تھی۔ وہ کسی سے بات چیت نہیں کرتی تھی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ راج بہے کے کنارے چانگ کا اور اُس کا سامنا ہوا۔ وہاں وہ کبھی چاول، کبھی دال ترکاری وغیرہ دھونے پچھوڑنے جایا کرتی تھی لیکن چانگ نے دیکھا کہ اسے مخاطب کرنا مشکل ہے کیونکہ چانگ سمجھتا تھا کہ اگرچہ اُس نے سزا جو دی وہ بالکل برحق تھی مگر پھر بھی وہ اُس سے نفرت ضرور کرتی ہے۔ وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر تسکین دے لیا کرتا تھا کہ ابھی مت چھیڑو۔ جلدی نہ کرو۔ اس میں خطرہ ہے۔ وہ جو مثل مشہور ہے کہ جلدی کا کام شیطان کا۔ اس سے بنتا کام بگڑ جاتا ہے۔ جن سان تو بالکل بے جان ہے اور اگر وہ وقت گزرنے کے ساتھ چوانگ شی والے عاشق کو بھول گئی تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور بگڑے کام خود بن جائیں گے۔

کوئی دس دن گزرے ہوں گے کہ ایک سنکٹ آپڑا اگر وہ ایسا سنکٹ نہیں تھا جس کی تمنا چانگ کو رہی ہوگی۔

آخرکار ایک دن جن سان کی بیوی نے اَپنا چُپ کا روزہ توڑ دیا۔ اُس نے پہلے کی طرح ہنسنا بولنا شروع کر دیا۔ خاص طور سے وہ اپنی ساس کے ساتھ ہِل مِل گئی۔ وہ بناؤ سنگار کرنے لگی۔ بال سنوارنے اور چوٹی گوُندھنے سے بھی دلچسپی لینے لگی جب کبھی جن سان کو وقت ملتا وہ اُس کے پاس آ بیٹھتی اور اُس کی رانوں میں چٹکیاں بھرتی۔ چُھپکے چُھپکے اُس سے کُھسر پُھسر کرتی۔ نہیں معلوم کیا کیا باتیں بنایا کرتی۔ بعد میں وہ جن سان کو کنکھیوں سے دیکھتی۔ غمزے کرتی اور مُسکراتی۔ جن سان اس پر خوب کِھلکھلا کر ہنستا اور زور زور سے اُس پر گالی گفتار کرتا۔

ساس کو جیسے ہی یہ محسوس ہوتا کہ کچھ ہونے والا ہے تو وہ کسی بہانے اپنی کھاٹ پر چلی جاتی یا اِدھر اُدھر سرک جاتی۔ جن سان اور اُس کی بیوی جیسے ہی رات کو کمرے میں پہنچتے تو بڑی بی باہر سے کمرہ بند کر دیتی تھی۔

یہ خبر چانگ کو بھی پہنچی مگر اُسے واقعے کی اس تبدیلی سے افسوس ہوا۔

"ایسی خوبصورت عورت اور اس گنوار کے پلّے بندھ گئی۔ یہ کیا واہیات بات ہے۔ گدھا کہیں کا۔ سؤر۔ گھوڑے پر جیسے کسی نے پُھلواری لگا دی ہو۔

اور اب چونکہ وہ پھر سے مانوس اور کِھلنڈری ہو چلی تھی اس لئے چانگ نے سوچا۔ وقت آگیا ہے کہ اسے دھیرے دھیرے راہ پر لایا جائے اور اس کے دل میں اپنی جگہ بنائی جائے۔ آخر میں وہ خود ہی شاید اُس کی طرف جُھک جائے گی۔

اس خیال کا آنا تھا کہ وہ مُسکرایا۔ آنکھیں بھینچتے بھینچتے اَدھ کُھلی رہ گئیں۔ اُسکی کلائی میں شوخ رنگ کا کڑا پھسل گیا۔ اُس کے دماغ میں ناگہانی خیال آیا کہ شاید وہ چاندی کے سکّوں کو زیادہ پسند کرتی ہوگی۔

شام ہوتے ہوتے وہ راج بہے کے کنارے ٹہلنے نکلا۔ جیب میں پانچ روپے کھنک رہے تھے۔

وہ عین اُسی وقت چاول دھو کر نمٹی تھی اور گھر واپس جانے والی تھی۔

"او ہو — تم کام میں لگی ہوئی تھیں" اُس نے کہا۔

"اچھا تو مُکھیا جی ہیں" جواب میں مُسکراتے ہوئے اُس نے کہا۔

وہ اُس کے اور قریب گیا مگر عورت ذرا بھی نہیں جھجکی۔ ایک دم مُکھیا کی زبان پر تالا پڑ گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ آگے اُس سے کیا کہے۔ مُکھیا پن کی شان میں بات کرے یا بہت دھیرے سے ہلکی پھلکی باتیں کرے۔ تھوڑی دیر وہ بالکل چُپ چاپ کھڑا رہا اور پھر لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے بولا۔

"کیا — وہ — میرا مطلب ہے کہ وہ — جن سان گھر پر ہی ہے؟"

"کیا حضور کو اُس کی تلاش تھی؟"

"نہیں نہیں۔ قطعی نہیں۔ مجھے اُس کی تو بالکل تلاش نہیں تھی ...... ہاں اور کہو ......"

عورت نے مُکھیا کی طرف مُسکراتے ہوئے دیکھا۔ مُکھیا کا دل بہت چاہا کہ کسی طرح ایسی کوئی بات کرے جو عورت کے دل میں ترازو ہو جائے۔ مگر وہ بات کیا ہو۔ کیا لفظ کہے جائیں؟

"ارے تمہیں چاندی کے سکّے پسند ہیں کیا؟"

جن سان کی بیوی اس پر مُسکرائی مگر ساتھ ہی اُس نے اپنا سر نہوڑاتے ہوئے دبی دبی زبان میں کہا "اگر جن سان کو اس کی خبر ہو گئی تو وہ مجھے مارے گا۔" یہ کہتے وقت اُس نے اپنے ہونٹ خصوصیت سے آگے کو نکالے۔

چانگ بے قرار تھا کہ کسی طرح سے اپنی آغوش میں بھینچ لے۔ وہ چاہتا تھا کہ

اُسے گھر میں لے جائے اور حسرتیں نکالے۔ وہ اُس کے لبوں کو پیار سے کاٹنا چاہتا تھا۔ اُس کے دل میں تمنا تھی کہ عورت کا جسم سہلائے، یہ جسم، اور کیسے افسوس کی بات ہے کہ جن سان اُس پر ہاتھ اُٹھائے گا۔

"میں تمہیں بچالوں گا..... اگر جن سان سے تمہیں ڈر لگتا ہے تو....."

وہ اُس کے اور قریب آگیا۔ اُس نے عورت کے کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا اور ہاتھ سے اُس کا شانہ دبایا۔ وہاں سے اُس کا ہاتھ پھسلتا ہوا بازو پر تیرنے لگا۔ عورت چُپ کھڑی رہی۔ اُس نے جھٹکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔

یہ زندگی میں دوسرا موقعہ تھا جب وہ اُسے اپنے ہاتھوں سے مَس کر رہا تھا مگر اب کی بار بایاں ہاتھ مصروفِ کار تھا کیونکہ داہنے ہاتھ میں اب بھی چاندی کے پانچ سکے دبے ہوئے تھے۔ وہ چاہتا تھا کہ ان روپوں کو کسی طرح عورت کے ہاتھوں میں پہنچا دے۔

پھر اُسے خیال آیا کہ نہیں کہ پانچ روپئے کچھ زیادہ — یعنی ذرا زیادہ رقم ہے۔ اُس نے دو روپئے پھر سے بٹوے میں ڈال لئے۔ باقی جو تین روپئے بچے تھے وہ اُس نے عورت کی مُٹھی میں رکھ دئے۔

وہ مُسکرائی مگر روپیہ اُس نے نہیں لیا۔

یہ سوچ کر کہ وہ شرم و حیا کے مارے نہیں لے رہی ہے اُس نے تینوں روپئے اُس کی جیب میں ڈال دئے۔ جب وہ روپئوں کو اُس کی جیب میں ڈال رہا تھا تو اُس کا ہاتھ عورت کے سینے سے چھو گیا۔ یہ تیسرا موقعہ تھا جب اُس کا ہاتھ اس جسمِ نازک کو مَس کر گیا اور اس بار پھر سیدھے ہاتھ کو ہی موقعہ ملا۔

"ذرا سنبھال کے" اُس نے طنز کیا "کہیں کوئی دیکھ نہ لے"

وہ زور سے ہنسا۔ ہنسنے میں اُس کا مُنہ ایسا کھُلا کہ اندر سے بے تُکے دانتوں کی

قطار جھانکنے لگی جن پر زردی اور میل جما ہوا تھا۔ شاید اُس نے شام کا کھانا کھانے کے بعد سے اب تک دانت نہیں کُریدے تھے۔

"جن سان سے کیوں ڈرتی ہو میری پیاری۔ دل میں سوچ لو۔ جس دن تم چاہو بس اُسی دن —"

"اچھی بات ہے"

"تو کب مجھے بتا دو گی؟"

اُس نے ہاں کے انداز میں سر ہلایا اور تیزی کے ساتھ وہاں سے غائب ہو گئی۔ چانگ نے بڑے اطمینان اور سُکون کا سانس لیا۔ اس کے بعد وہ ہوا میں اپنے سر کو ہلا ہلا کر دائرے سے بنانے لگا جیسے کوئی بڑا صاحبِ نظر نقادِ فن کسی تصویر کو دیکھ کر اُس کی تعریف میں سر ہلاتا ہے۔ اُسے مایوسی بھی تھی کہ آج ہی کی رات وہ رات کیوں نہ ہوئی جب اس سے پہلو گرم ہوتا۔ وہ آپ سے آپ بڑبڑایا "دیکھو خُدا کی قُدرت اسے کہتے ہیں"

آسمان پر نارنگی رنگ پھیل چکا تھا اور کہیں کہیں بادلوں کے ٹکڑے بکھرے پڑے تھے۔

(۴)

جب وہ اپنے کسی آدمی سے بات کرتا ہوتا تھا تو دانت کُریدنا اس کی عادت میں شامل تھا۔

"جاؤ۔ جن سان سے کہہ دو کہ وہ اپنا قرض چُکا دے اور کہنا کہ اصل معہ سُود کے ادا کرنا ہوگا اور یہ بھی جتا دینا کہ اب ایک دن کی بھی مہلت نہیں ملے گی"۔ اُس نے پھر دانت کُریدا۔ "اُس سے کہہ دینا کہ دو بار تمہیں مہلت دی جا چکی ہے۔ اب مجھے خود روپئے کی بہت سخت ضرورت ہے، ملنا ہی چاہیئے — سمجھے۔ سُنا تم نے؟

سُن رہے ہو کہ نہیں؟"

"جی حضور"

"ایسا لگتا ہے جیسے تم نے میری بات سُنی ہی نہیں۔ دیکھو بہت خاص کام ہے مجھے روپیہ واپس ملنا ہی چاہیئے جیسے بھی ہو۔"

اسے خیال آیا کہ اپنے اس آدمی سے عورت کا ذکر کر دے کہ نہیں۔ جانگ خوب جانتا تھا کہ جن سان روپیہ واپس نہیں کر سکے گا۔ یہی تو وہ خود بھی چاہتا تھا کیونکہ روپئے کے بدلے وہ کوئی ضمانت جن سان سے طلب کر سکتا تھا مگر اس سے پہلے کہ اپنے ہرکارے کو وہ اچھی طرح سمجھا سکے خود ہرکارہ ہی اُس کی طرف جُھکا اور اُس نے رازدارانہ انداز میں مکھیا سے کہا۔

"تو کیا میں اس سے کہہ دوں کہ تمہیں عورت ضمانت میں رکھنی پڑے گی اور جب قرضہ ادا ہو جائے تو وہ اپنی عورت واپس لے لے۔ کیوں ہے نا حضور؟"

اگرچہ مکھیا کے دل میں یہ سُن کر بتاشے پھُوٹے لیکن اُس نے تیوروں سے ایسا ظاہر کیا جیسے بہت بُری بات ہے۔

"احمق کہیں کا۔ چونچ بند کر۔ لوگوں سے کہیں ایسے برتاؤ کیا جاتا ہے؟"

"اچھا یوں نہیں تو وہ اُسے نوکرانی کے کام کے لئے بھیج دے....."

مکھیا تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔

"مجھے تو اپنے روپئے سے مطلب ہے" یہ کہتے ہوئے اُس نے میز پر گھُونسہ مارا۔ "اچھا ٹھیرو — مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے — مگر دیکھو — اور ہاں خوب سمجھ لو کہ کسی اور کے کان میں اس کی بھنک تک نہیں پڑنی چاہیئے۔"

ایجنٹ نے اس طرح سر جُھکایا جیسے وہ کہہ رہا ہے — "حضور بسر و چشم" اُس نے کہا "بالکل بالکل۔ میں تو حضور کا نمک خوار اور جان نثار ہوں۔ آپ تو

میرے مائی باپ بلکہ ان سے بھی زیادہ دیالو ہیں۔ آپ چاہیں تو پوچھ لیجئے سبھوں سے ہر آدمی کہہ دے گا کہ میں کتنا آپ کا حکم مانتا ہوں۔ حضور۔ اگر ضرورت آپڑے تو آپ پر سے جان قربان کردوں۔"

"ہاں۔ ہاں میں مانتا ہوں، اور تم نے تو میرے لئے بڑے کام کئے ہیں"

کئی دن گزر گئے۔ مکھیا کا آدمی جن سان کے ہاں گیا اور اُس سے کہہ آیا کہ مکھیا کا حکم ہے روپیہ اب ادا ہو جانا چاہیئے۔ جن سان نے سُنا تو وہ سکتے میں رہ گیا۔

"اب تو کوئی تدبیر نہیں رہ گئی ہے" جن سان نے کہا۔

مکھیا کا ہرکارہ مُسکرایا اور اس نے کانا پھُوسی کے طریقے سے کہا "نہیں تدبیر ہے کیوں نہیں۔ تدبیریں ایک سے زیادہ"

"تو کیا مکھیا سود بڑھا کر مان جائیں گے" جن سان نے اُمید بھرے لہجے میں پُوچھا۔

"نہیں۔ خیر اس سے تو کام نہیں چل سکتا" ہرکارے نے شرارت بھری مُسکراہٹ کے ساتھ کہا "مکھیا جی نے طے کر رکھا ہے کہ یا تو روپیہ ملے یا پھر روپے کی قیمت کی کوئی اور چیز دی جائے" ہرکارہ پھر مُسکرایا۔ اُسے خیال آیا کہ اگر میں نے اپنا کام پُورا کر دکھایا تو مکھیا کی آنکھوں میں میری عزّت بڑھ جائے گی۔

"اچھا تو میں خود ہی مکھیا کے پاس جاؤں گا اور اُن سے پوچھوں گا" جن سان نے بڑی مایوسی کے ساتھ کہا۔

"اوہ یہ تو قطعی ممکن ہی نہیں ہے" ہرکارے نے جواب دیا۔ اُس کی آنکھیں کھُلی کی کھُلی رہ گئیں جیسے وہ حیرت زدہ رہ گیا۔ "تم تو جانتے ہو کہ مکھیا مزاج کا خراب آدمی ہے۔ غصّہ آجائے تو جب وہ کسی بات پر اُتارو ہو جائے تو پھر ٹال جانا مشکل ہے مگر مجھے ایک خیال آیا ہے۔ بس ایک ترکیب ہے۔ دیکھو مجھے سُوجھی ہے.... بُرا مت

مانتا..... شاید مکھیا اس سے مان جائے۔"

جن سان کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے تھے۔ وہ چیخ مار کر رونے والا تھا کہ اُس نے زور سے کہا "بتاؤ۔ بتاؤ کیا ہے وہ تدبیر؟"

"اُس کے پاس ضمانت رکھوا دو کچھ....."

"میرے پاس ضمانت رکھوانے کو کیا دھرا ہے۔

"اچھا تو ایسا کرو۔ آدمی کو ضمانت میں رکھوا دو"

جن سان نے اطمینان کا سانس لیا۔ ہاں گھر میں ایک انسانی جسم تو تھا جسے ضمانت کے طور پر مکھیا کے پاس رکھوایا جا سکتا تھا۔ اچھی بات ہے مگر۔"

"تو کیا مکھیا اس کے لئے تیار ہے کہ وہ عورت کو ضمانت میں رکھ لے گا؟"

"ابے گدھے۔ ذرا جا تو اس کے پاس۔ مکھیا سے مل کر تو دیکھ۔ تجھے معلوم ہو جائے گا اس کا خیال"

"تم میرے ساتھ چلے چلو گے؟"

"ہاں ہاں"

طے پایا کہ دونوں ساتھ جائیں گے کچھ دن بعد اور مکھیا سے مل کر بات چیت کریں گے۔

(۵)

پھر گاؤں میں کچھ اور افواہیں پھیلیں۔

چوانگ شی گاؤں سے ایک بھکاری آیا تھا۔ وہ اپنے ساتھ خط کا پُرزہ بھی لایا اور جن سان کی بیوی کے حوالے کر دیا۔ عورت کو لکھنا پڑھنا آتا تھا۔ اُس نے فوراً خط کا جواب لکھا اور اُسی بھکاری کو وہ پُرزہ دے دیا۔

"اُس نے بھکاری کو دو روپے بھی تو دے تھے" کسی نے کہا۔

اتنے میں کہ اُس کی ساس کو بھکاری کی بات کا پتہ چلے وہ جاچکا تھا۔
چانگ کو جیسے ہی یہ خبر پہنچی اُس کی آنکھوں کے سامنے ساری حقیقت کھل گئی۔
اچھا تو یہ بات ہے۔ میری ساری اُمیدوں کا یہ صلہ ملا ہے مجھے۔ وہ اُس عورت کی
جیب میں تین روپے ڈال چکا تھا۔ اب اگر وہ نکل بھاگی تو بڑا نقصان ہو جائے گا۔
چانگ کو اُمید ہو چلی تھی کہ وہ اُس سے اب گھُل مل جائے گی لیکن یہ کیا ہوا کہ اُسی کا
دیا ہوا روپیہ اور بھکاری کو بخشش میں چلا گیا۔ یہ تو بڑی اشتعال انگیز حرکت ہوئی مگر بعد
میں اسے خیال آیا کہ کوئی بات نہیں۔ ہے تو وہ عورت ہی۔ ذرا ہاتھ آجائے۔ پھر خود ہی
پاؤں پسار دے گی۔ بس یہ کرنا چاہیئے کہ وہ یہاں سے فرار نہ ہونے پائے۔
جن سان کو بھی یہ اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں اُس کی بیوی پھر فرار نہ ہو جائے
کیونکہ اگر وہ ہی چلی گئی تو پھر کھیا کا قرضہ کیسے ادا ہو گا۔ جیتے جی گلے میں پھانسی ڈالنی
پڑے گی۔ اُسے خیال آیا کہ اگر میں جلدی کروں اور جا کر چانگ سے مل لوں۔ بات چیت
کر کے معاملہ طے کر لوں تو قرضے کی دستاویز وہ چاک کر کے پھینک دے گا اور پھر
اگر بیوی بھاگ بھی گئی تو کوئی غم نہیں۔ حساب تو صاف ہو چکا ہو گا۔
"حضور — وہ میں اپنے قرضے کے بارے میں کہنا ....." اُس نے لکنت کرتی ہوئی
زبان سے کہا اور کنکھیوں سے کھیا کے ہرکارے کو دیکھا جو اُس کے ساتھ ساتھ گیا تھا
اور جس کے انداز نے یہ جتا رکھا تھا کہ فکر مت کرو۔ سب ٹھیک ہے۔ معاملہ ہو جائے گا۔
جن سان دبی ہوئی آواز میں بولتا گیا۔ مچھلی کی طرح۔ "حضور میں' اگر حضور کا اطمینان
ہو جائے تو اُسے میں آپ کی خدمت میں حاضر کر دوں؟"
"ابے اپنا گندا منہ بند کر۔ ایسی گری ہوئی عورت کو میں اپنی نوکرانی کیسے بنا لوں گا۔
بکواس۔ بیہودہ بات۔" چانگ نے گرج کر کہا۔ "مجھے تو اپنا روپیہ چاہیئے۔ جاؤ روپیہ
لے کر آؤ۔ جتنی جلدی لے آؤ اچھا ہے۔"

جن تسان کو ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے بدن پر کسی نے برف کا پانی بھر کر انڈیل دیا۔ مکھیا کے آدمی نے تو اُمید دلائی تھی کہ مکھیا اس شرط پہ رضامند ہو جائے گا۔ جن تسان کو آس تھی کہ جیسے ہی وہ قرض کے بدلے میں اپنی بیوی کو ضمانت کے طور پر پیش کرے گا فوراً اس کا قرضہ معاف ہو جائے گا۔

صحیح بات ہے کہ جن تسان کی بیوی حلوے کا لقمہ اور مکھن کی ٹکیا تھی۔ وہ تھی ایسی ہی نرم و نازک۔ مگر اس کا مطلب یہ کہاں ہوا کہ ایک سو چالیس ڈالر کی رقم بھی اس کی خاطر قربان کر دی جائے۔ چانگ کو تو بھولے سے بھی ایسا خیال نہیں گذرا تھا۔ اس کی نیت یہ تھی کہ جن تسان کی بیوی اس کے پاس ضمانت کے طور پر رہے اس وقت تک کے لئے جب تک کہ شوہر اپنا قرض ادا نہ کر دے۔ قرضہ ادا کر کے وہ پھر واپس لے جائے اپنی امانت۔ اور پھر ایک مشکل اور تھی کہ اگر وہ عورت مکھیا کے گھر رہنے آجاتی تو اس سے ساری برادری میں افواہیں پھیلنا شروع ہو جاتیں۔ اور مکھیا کو خواہ مخواہ افواہوں کا نشانہ بننا پڑتا جو سرے سے نقصان ہی نقصان تھا۔

"اچھا تو میں تین فی صدی سود بڑھا کے دیدوں گا۔" جن تسان نے ہاتھ پاؤں مارنے کی ایک اور کوشش کی مگر مایوسی کے ساتھ "اگلے برس میرے پاس روپیہ آجائے ذرا۔"

"نہیں" صرف یہ ایک لفظ کہہ کر مکھیا اندر کے کمرے میں چلا گیا۔

"اب بتاؤ کیا کروں؟" جن تسان نے مکھیا کے آدمی سے پوچھا۔

"ٹھہر، میں تیری طرف سے بات کرتا ہوں۔" ہرکارے نے جواب دیا اور وہ بھی اندر والے کمرے میں پہنچ کر غائب ہو گیا۔

دس منٹ بعد مکھیا کا آدمی اپنے آقا کے پاس سے واپس ہوا۔ جن تسان کا حال اس وقت بھی ایسا تھا کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔

"چلو۔ طے ہو گیا قصّہ۔"

"وہ کیسے ؟" جن تسان نے پوچھا۔
"باہر چل کر بات کریں گے ہم تم"!
خوشی کے مارے جن تسان کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔
"تو کیا بالکل بات پکی ہو گئی ؟" اس نے پھر مکھیا کے آدمی سے پوچھا۔
"ہاں۔ دیکھو یہ قرار پایا ہے کہ ....!" ہرکارے نے بجلی کے پنکھے کی طرح آنکھ مار کر اور ہاتھوں کو مٹکا کر جواب دیا۔ پھر اس نے تفصیل سے سمجھایا کہ جب تک تمھاری بیوی مکھیا کے گھر کا کام کاج کیا کرے گی وہ کچھ نہیں بولے گا۔ اور معاملہ ٹھیک چلتا رہے گا وہ خدمت کرنے وہاں چلی جایا کرے مگر رہے اپنے شوہر کے گھر میں۔ جب کبھی مکھیا کو اس کی ضرورت ہوا کرے گی وہ بلا بھیجے گا۔ سب بتا دینے کے بعد آخر میں مکھیا کے آدمی نے جن تسان کو خبردار کیا کہ یہ سب تو ہے مگر دیکھو زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلے کسی سے اس بات کا ذکر مت کرنا۔
"اچھا تو میں کسی سے اس کا ذکر نہیں کروں گا مگر میرے قرضہ کا کیا ہو گا ؟"
جن سان اس شرط پر چٹ سے رضامند ہو گیا۔
"قرضے کی ادائیگی تو اگلے برس کی ناگ پنچمی تک ٹل گئی۔ سود بھی وہی چار فیصدی رہے گا۔ مگر دیکھو کسی سے ذکر مت کر دینا۔"
اسی شام کو مکھیا کا پیغام جن تسان کے گھر پہنچا کہ اپنی بیوی کو بھیجدو۔ جن سان کو پیغام کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا کہ تم اپنی بیوی کو لے کر راج بہے کے پل تک چلے آؤ۔ کہیں وہ اکیلے میں بھاگ نہ جائے اور پل پر مکھیا خود موجود ہونگے۔ عورت کو اپنے ساتھ لے جائیں گے۔ کسی اور کو، یہاں تک کہ خود مکھیا کے کسی آدمی کو بھی اجازت نہ تھی کہ ان کے ساتھ رہے۔
مشرق میں آدھا چاند نارنگی کی قاش کی طرح اُبھرا۔ چانگ اپنے گھر سے نکلا اور ٹہلتا

ہوائیں کی طرف چلا۔ عمر رسیدہ چانگ کے چہرے کی ہڈیاں آگے کو نکلی ہوئی تھیں اور چاند کی کرنوں میں چمک رہی تھیں۔ اسے خیال آیا کہ یہ منظر بہت دل کش اور لبھانے والا ہے مردہ شاخیں اور ٹہنے ہل رہے تھے۔ سامنے بھورے رنگ کی پہاڑیاں مسکرا رہی تھیں اور قبروں کے نشان زمین پر اس طرح ابھرے ہوئے تھے جیسے جن سان کی عورت کا سینہ۔ ہاں۔ ہے تو۔ مگر یہ قبروں کے تودے سخت سخت ہیں ...... اس نے پچھم کی طرف دور تک دیکھا مگر کہیں جن سان اور اس کی بیوی کا نام و نشان نہیں تھا۔

اس نے سوچا کہ اب اس عورت کو میرے خلاف کیا نفرت ہوگی۔ 'اگر جن سان کو خبر ہو گئی تو وہ مجھے مارے گا' یہ الفاظ تھے جو اس عورت نے اپنے ہونٹوں کو ذرا اُبھار کر کچھ روز پہلے کہے تھے۔ وہی تو تھی جس نے اپنے جسم کو ہاتھ لگانے کی اجازت دی اور اپنے شوہر سے نفرت کا اظہار کیا۔ نفرت کا اظہار مسکرا کر کیا۔ غضب کی مسکراہٹ تھی اس کی۔

وہ اِدھر سے اُدھر چہل قدمی کرتا رہا۔ دانت کریدتا رہا۔ بار بار وہ اپنے ہاتھوں سے چہرے کو رگڑتا تھا۔ اور انگلیوں میں جو رال لگ جاتی تھی۔ اس کی چکنائی چہرے سے پونچھ لیتا تھا۔ ایک سمت میں وہ دس قدم چلتا اور پھر دوسری سمت میں اتنی ہی دور تک ٹہلتا۔ ذرا سی آہٹ پر اس کے کان کھڑے ہو جاتے تھے۔ ایک دم اُسے نظر آیا کہ دور سے دو وجود چلے آرہے ہیں۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو یہ وہی ہے وہ کچھ اس طرح کی تھی کہ تیس میل کا فاصلہ ہو تب بھی مکھیا اسے پہچان لیتا۔

مکھیا پر اس احساس سے ایسی جذباتی بیقراری طاری ہوئی کہ بدن لرزنے لگا۔ اب وہ اسے ......'

جن سان قریب آیا تو مڑ گیا اور اپنے گھر کی طرف اُلٹے پاؤں جانے لگا۔ اور فوراً اسی لمحے مکھیا تیزی سے اس کی طرف بڑھا کہ کسی طرح اس کا سینہ چھوئے۔

"ایسی جلدی کیا پڑی ہے۔" عورت نے اٹھلا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں ایک زمانے سے اسی دن کا انتظار کرتا رہا ہوں۔ اب مجھ سے انتظار نہیں ہوتا۔ چلو۔ اب چلیں.........."

"دم تو لینے دو، ذرا ٹھہرو۔"

"اوہ۔ بہت اچھا۔"

"ذرا مجھے آرام تو کر لینے دو، کیسے مزے کی شام ہے۔" وہ اس کی طرف دیکھ کر پھر مسکرائی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دم پھول رہا ہے کسی قدر۔

وہ جس راستے سے آئی تھی۔ اسی کو مڑ کر دیکھنے لگی۔ جن تمان وہاں سے جا چکا تھا ہر طرف خاموشی تھی اور سناٹا۔ چاند اس کی شفاف آنکھوں پر چمک رہا تھا۔ مکھیا اُسے بڑے غور سے للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا اور بار بار اس کے گلابی گالوں میں چٹکیاں بھرے جاتا تھا۔ اس کے سینے اور ٹانگوں کو نوچتا تھا۔ مکھیا کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور گھٹنے جواب دینے لگے۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی طرح جلدی سے اس نرم گدے کی طرف اسے لے کر پرواز کر جائے جو گھر میں اس کا منتظر ہے۔ جسم بھاری ہوا جا رہا تھا۔

"اب چلو۔ اُٹھو۔ چلیں۔"

عورت چپ رہی۔ اس نے اس وقت بھی جواب نہیں دیا۔ جب مکھیا نے اسے اپنے بازوؤں میں بھینچا۔

ایک دم دھماکے کی سی آواز ہوئی۔ عورت نے گھونسا تان کر مکھیا کے منہ پر جا دیا۔ مکھیا کی نکسیر پھوٹ پڑی۔ اور وہ پیچھے کو ڈھلک گیا۔

"تو نے یہ کیا حرکت کی؟"

"کیونکہ میں چیانگ سٹی جا رہی ہوں۔"

وہ اُٹھ کر بھاگنے ہی والی تھی کہ مکھیا نے اس کے بازو پکڑ لیے مضبوطی سے۔

"سؤر کہیں کا۔ جانور۔ طاعون" وہ زور زور سے کوسنے لگی اور کھیا کے سر پر تڑاتڑ گھونسے جمانے لگی: "آج تو میرے پنجے میں پھنسا ہے۔ جانور۔ ذلیل کہیں کے"

عورت نے اس زور سے اُسے دھکیلا کہ وہ کیچڑ میں گرا۔ اسے دھکیل کر وہ خود رفوچکر ہو گئی۔ پل پار کرکے وہ اُتر کی طرف دوڑی جا رہی تھی۔ وہ بڑا راستہ چھوڑ کر کھیتوں نالوں اور ٹیلوں کو پھلانگتی ہوئی سیدھی چوانگ سٹی کی طرف جا رہی تھی۔

'جن سان کی بیوی فرار ہو گئی'

کئی آدمی اس کے تعاقب میں دوڑائے گئے۔ مگر وہ کسی کے ہاتھ نہ آئی۔ چوانگ سٹی میں بھی نہ اس کا کوئی پتہ چلا نہ اس کے عاشق کا۔ چوانگ سٹی والوں کا بیان ہے کہ وہ دن نکلنے سے پہلے یہاں آئی تھی۔ اس کا عاشق انتظار کر رہا تھا۔ اس کے آتے ہی دونوں نے فوراً تھوڑا سا سامان لپیٹا اور اپنی بچی کو لئے ہوئے یہاں سے غائب ہو گئے۔

کسی کو خبر نہیں تھی کہ وہ لوگ کہاں چلے گئے۔

از شن ُتنگ وَن

۱۹۰۲ء میں پیدا ہوا۔ چانگ کی طرح اس کی جنم بھومی بھی ہونان کا حسن خیز خطّہ ہے جس کے گُن وہ اپنی تصنیفوں میں گاتا رہا ہے۔ وہ بھی لوتزون کی ادبی تحریک کی پیداوار ہے اور اس کا ممتاز نمائندہ۔

شن ُسنگ وَن کا "پیشہ آبا سپہ گری" تھا۔ بارہ سال کی عمر سے اس کی زندگی آوارہ گردی، سفر در سفر اور فوجی معرکوں میں گذری۔ اس نے چینی عوام کی زندگی کے ہر رُخ کو دیکھا ہے اور ہر زاویے سے دیکھا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی تصویریں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے ساختہ ہیں اور ان میں کسی قسم کے تکلف کو دخل نہیں۔

شن ُسنگ وَن نے باقاعدہ تعلیم کا بہت کم عرصہ گذارا۔ ڈکنس کے جو ناول چینی زبان میں ترجمہ ہوئے ان کا شن ُسنگ وَن کے دماغ پر اور انداز بیان پر بھی گہرا اثر ہوا۔

اس کی تحریروں کا کمال یہ ہے کہ وہ بے تکلفانہ لکھتا ہے۔ دریائے چِن کی وادی

کے ایک ایک ذرّہ سے اسے بے پناہ محبت ہے۔ زمین سے اس کی یہ محبت کسان کرداروں کی تخلیق اور ان کی تصویر کشی میں بہت کام آئی ہے۔ اگرچہ اس کے بیان میں کہیں کہیں شاعری کا عنصر بھی نظر آتا ہے لیکن اس کا انداز بیان اپنے ہم عصروں میں سب سے الگ ہے۔

فوجی زندگی سے اُکتا کر وہ پی پینگ چلا آیا اور یہاں اس نے زیادہ تر تصانیف پیش کیں۔ اسے چینی زبان و بیان پر بڑا عبور حاصل ہے اور بیان کو دردانگیز یا ہولناک بنانے سے اُسے چڑھ ہے۔

رابرٹ پین نے اس کی ابتدائی کہانیوں کو گورکی کے افسانوں سے تشبیہ دی ہے جن میں یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کہانی لکھی جا رہی ہے بلکہ یہ احساس ہوتا ہے کہ آپ بیتی سُنائی جا رہی ہے۔ لیمپ کہانی اس ٹکنیک کی پوری نمائندگی کرتی ہے۔

آج کل شن سُنگ وین تصنیف، تالیف اور تعلیم کے کاموں میں مصروف ہے اور لینتا یونی ورسٹی میں چینی ادب کا پروفیسر ہے۔ اس کے افسانوں کے کئی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

دو سال ہوئے۔ ان دنوں میں کالج میں پڑھتا تھا۔ جبھی اس مکان میں رہنے لگا تھا۔ اس مکان کے اگلے کمرے کو میں اپنے مطالعے کے لئے اور پچھلے کمرے کو خواب گاہ کے طور پر استعمال کرتا ہوں۔ مئی کا مہینہ تھا۔ عجیب بات یہ ہوئی تھی کہ بجلی کی روشنی خود بخود گُل ہو جاتی تھی۔ کبھی یوں ہوتا کہ شام کا وقت ہے۔ چاولوں کی قاب اور چمچے میز پر تیار رکھے ہیں۔ میں ان پلیٹوں کو بڑے غور سے دیکھ رہا ہوں جو ہمیشہ مزے دار ہوا کرتی ہیں۔ اور سوچ رہا ہوں کہ باورچی کا احسان مانوں اور تہہِ دل سے شکریہ ادا کروں کہ اتنے میں بجلی غائب۔ اور رات کا کھانا ملتوی۔ نہیں معلوم کب تک کے لئے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ اطمینان سے رات کا کھانا کھا کر بیٹھے ہیں۔ کتاب پڑھ رہے ہیں۔ یا کوئی ملاقاتی کسی خاص مسئلہ پر بات چیت کرنے پر آیا ہے۔ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک دم بجلی گُل ہو گئی۔ کئی بار ایسا ہوا کہ میں اور میرا ایک دوست بڑے غور سے قدیم چین کی ایک ایسی یادگار تحریر کو پڑھنے میں مغز کھپا رہے ہیں جس پر اعراب بھی نہیں ہیں اور بہت شکستہ خط میں لکھی ہوئی ہے یا کسی بہت پرانی مہر کو غور سے دیکھ رہے ہیں۔ اسے پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اصلی ہے یا نہیں۔ اتنے میں بجلی غائب ہو جائے گی اور اچانک اندھیرا ہمیں اپنا کام روکنے پر مجبور کر دے گا۔ ہم لمبی سانس لے کر رہ جائیں گے۔ میرا دوست

جو خود ایک فن کار، مصوّر اور نقاش تھا اور عام طور سے بہت نرم مزاج اور شریف طینت انسان تھا ایسے موقع پر اپنے غصّے کو برداشت نہ کر سکتا۔ اور بجلی سپلائی کمپنی کو غیر ذمّہ دار اور لچر کہہ کر کوسنے لگتا۔

کوئی دو ہفتے اسی طرح ہو گئے لیکن اس ناوقت پریشانی میں کوئی کمی نہ ہوئی کئی گھروں سے اس سلسلے میں خط بھیجے گئے۔ شکایتیں کی گئیں۔ کمپنی کو تحقیق کرنے کے لئے لکھا گیا لیکن صرف اتنا ہوا کہ بجلی سپلائی کمپنی نے اپنے آسامیوں کے نام ایک معذرت نامہ اخباروں میں شائع کر دیا اور اس میں یہ عذر پیش کیا کہ بجلی کی خرابی دراصل موسم کی خرابی کا نتیجہ ہے۔ اسی دوران موم بتی کی قیمت بڑھتی چلی گئی اور فی پیکٹ پانچ سینٹ (پیسے) بڑھ گئے۔ مجھے باورچی نے بتایا کہ موم بتی مہنگی ہو رہی ہے۔ وہ یہ جتانا کبھی نہیں بھولتا کیونکہ جیسے وہ رات کا کھانا میز پر چنتا فوراً ایک موم بتی بھی میرے نزدیک نصب کر دیا کرتا تھا۔

میرا باورچی بڑا غیر معمولی آدمی تھا۔ ایمان دار اور بھروسے کا۔ کم عمری سے وہ میرے والد صاحب کا اردلی تھا اور ان کے ساتھ دُور دُور کا سفر کر چکا تھا۔ شمال مشرق، شمال مغرب کے دُور دراز علاقے یہاں تک کے منگولیا اور ژجوان اس کے چھانے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ وہ تن تنہا کو انگسی اور یونان تک گھوم آیا تھا۔ برسوں وہ میرے وطن میں رہ چکا تھا اور دادا جان کے مقبرے کی دیکھ بھال کر چکا تھا۔ پار سال جب انقلابی دستے شنتانگ صوبے کی طرف بڑھ رہے تھے تو وہ ان میں بھی کام کر چکا تھا۔ ۱۷ ویں رجمنٹ کے کمپنی کمانڈر کی ماتحتی میں وہ بڑے خانساماں کا عہدہ سنبھال چکا تھا۔ کِنفو کے مقام پر وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا کہ نہتّے شہریوں پر دشمن کی فوج نے کیسے کیسے ستم توڑے جن کو دیکھ کر آدمی ہل جائے۔ ایک رات جب کہ مشین گنوں کی تڑاتڑ ہو رہی تھی وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر اپنی جان لئے ہوئے

رجمنٹ سے نکل بھاگا۔ اور وہاں سے سیدھا نانکنگ پہنچا۔ کسی جان پہچان کے آدمی سے اسے میرا پتہ معلوم ہوا تو اس نے فوراً مجھے خط لکھا کہ اگر آپ چاہیں تو میں وہیں آجاؤں اور آپ کے گھر کی دیکھ بھال اپنے ذمہ لے لوں۔ میں نے اسے جواب لکھا کہ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ تم شنگھائی میں جاکر ڈنڈے بجاؤ۔ میرے گھر کی دیکھ بھال سے کیا حاصل۔ اس کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ میں تو بہت سادہ زندگی بسر کرتا ہوں۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ تم چلے آؤ تمہاری مالی مشکلات اور یا اور جو کچھ بھی پریشانی ہوگی اس میں تمہارا ہاتھ بٹا دوں گا، کچھ سہارا ہی ہو جائے گا۔ اور جب تمہارے حالات درست ہو جائیں تو واپس چلے جانا۔ بہر حال وہ میرے پاس چلا آیا۔ اس کے بدن میں بھورے رنگ کی وردی تھی جو ضرورت سے زیادہ کسی ہوئی اور پرانی ہو چکی تھی۔ میں نے وردی سے اندازہ لگایا کہ تین سال پہلے جب انقلابی فوج ہونان کے صوبے سے گزر رہی تھی اس وقت وہاں یہ وردی سلی ہوگی۔ اس کا بھرا بھرا مضبوط جسم اور چہرہ ایسی فوجی وردی اس پر بالکل زیب نہیں دیتی تھی۔ اس کے سامان میں ایک چھوٹا سا تھیلا تھا۔ گرم پانی کی بوتل تھی۔ دانتوں کا برش اور صندل کی لکڑی کے چمچے۔ گرم پانی کی بوتل اس کے شانے پر لٹک رہی تھی۔ بائیں طرف کی اوپر والی جیب سے دانتوں کا برش جھانک رہا تھا۔ اور جس طرح فوج میں ہوتا ہے اس کے چوبی چمچے[1] تھیلے کے اوپر بندھے ہوئے تھے۔ وہ لاجواب ملازم جس کا میں شب و روز ایک عرصے سے خواب دیکھ رہا تھا۔ میری نظر کے سامنے کھڑا ہوا تھا۔ مجھ جیسا نازک مزاج آدمی، مگر پھر بھی مجھے اس شخص میں کوئی ایسی بات نہ ملی جس سے نبھایا نہ جا سکے۔ ابھی کوئی بات چیت بھی نہ ہو پائی تھی کہ میں بیک نگاہ سمجھ گیا کہ اس شخص کا دل صاف، سادہ اور پاکیزہ ہے۔

---

[1] انھیں چمچہ ہی کہا جا سکتا ہے کیونکہ چینی اسی ترشی ہوئی لکڑی سے کھانا کھاتے ہیں۔

بہت سی چیزیں ایسی نکل آئیں جن پر ہم باتیں کیا کرتے تھے۔ گفتگو کے موضوع بھی عجیب عجیب تھے۔ کبھی دادا جان کا ذکر ہوا کرتا اور کبھی ابا جان کا، جو اپنے تصور میں پوتے کی خیالی تصویریں بنایا کرتے تھے۔ پُراسرار قسم کے پوتے کا تذکرہ ہوتا تھا جو ابھی تک ایک مسئلہ بنا ہوا تھا۔ یہ ملازم باتیں کرنے پر آتا تو لگاتار جملوں کا ایک تانتا بندھ جاتا تھا۔ وہ میرے خاندانی معاملات پر بھی بحث کرنے سے نہیں اُکتاتا تھا۔ اور جب اپنے تجربے اور زندگی کے واقعات بیان کرنے پر آتا تو بات کا انت ہی نہ ہوتا تھا۔ ذرا تصور تو کیجئے۔ ایک آدمی ہے جس کی عمر ہوگی پچاس کے قریب۔ اور چین کے بڑے علاقے کو اس نے ہمیشہ اپنی ٹانگوں کی سواری سے طے کیا تھا۔ اور بوکسر کی بغاوت کے بعد جو افراتفری اور خلفشار پھیلا تھا وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا چنگ خاندان کی حکومت کا تختہ جب اُلٹ گیا وہ ہنگامہ بھی اس نے دیکھا تھا۔ خانہ جنگی کے کئی معرکوں میں وہ خود شریک ہو چکا تھا۔ بھانت بھانت کے لوگوں میں رہ چکا تھا۔ سر بہ فلک پہاڑیوں اور طوفانی دریاؤں کو اس نے عبور کیا تھا۔ وہ ادبِ عالیہ کا ایک حصہ تھا۔ ایک ایسا شاہکار جسے پڑھے جاؤ اور کبھی ختم نہ ہو۔ جب بھی میں اس کی باتیں سُننا شروع کرتا تو اس کی باتوں سے میری دلچسپی اور حیرت کہیں سے کہیں پہنچ جاتی تھی۔ جب بھی کام سے فرصت ملتی تھی تو میں باتیں کرنے کے لئے اسے بلا لیتا اور جو بات دماغ پر طاری ہوتی اس کے بارے میں سوال کر ڈالتا۔ اس نے مجھے کبھی نا امید نہیں کیا۔

جس مکان میں کرایہ دار کی حیثیت سے میں رہتا تھا اس کی مالکہ میرے رہنے اور کھانے کا ۱۷ ڈالر ماہوار چارج کرتی تھی۔ دن میں دو وقت کا کھانا مقرر تھا بڑی ہوشیار عورت تھی۔ کہیں یانگسی پار کے کسی گاؤں سے آئی تھی۔ باقلے کی پھلیوں کا سالن یا مچھلی کے ٹکڑے جو باری باری کھانے میں آتے تھے، اور وہ جتنے

کچھ بھی بھیج دیتی تھی مجھے بڑا مزا دیتے تھے۔ اس کے سوا شاذ و نادر ہی کبھی کوئی چیز کھانے پر آتی تھی۔ کبھی کبھی وہ کباب (خنزیر) بھی بھیجتی تھی۔ ذرا سا میٹھا یا مچھلی۔ بھنی ہوئی یا تلی ہوئی نہیں بلکہ صرف بھاپ میں پکائی ہوئی۔ اور اسی میں سوئے کی ترکاری کے قتلے

میرا ملازم چونکہ ابھی نیا تھا اس لئے اجنبی ہونے کی وجہ سے دو ایک دن تو چپ رہا اور اس نے کھانے کی شکایت نہیں کی مگر تیسرے دن اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے مجھ سے روپیہ مانگا۔ میں نے اُسے دس ڈالر دیدیئے بغیر یہ سوچے کہ وہ ان دس ڈالروں کا کیا کرے گا اور کیوں چاہتا ہے۔ اسی دن شام کو وہ کھانے پکانے کے برتن خرید لایا اور جب رات کے کھانے کا وقت آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ خانساماں اپنی فوجی وردی ڈاٹے ہوئے نکلا۔ چاولوں کی قابیں اس کے ہاتھوں میں تھیں۔ کہنے لگا کہ آج میں نے ہی کھانا تیار کیا ہے اور اگر آپ کی رضامندی ہوئی تو آئندہ اس سے بھی اچھے کھانے تیار کر کے کھلاؤں گا۔ دستر خوان کی سادگی اور کھانے کی بھوک تیز کرنے والی مہک نے میرے دل و دماغ میں زندگی کی یادیں تازہ کر دیں۔ کھانے کے دوران ہم صرف اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے کہ سپاہیوں پر کیا گزرتی ہے۔ ان کا کیا حال ہے وغیرہ وغیرہ۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد اس نے دستر خوان بڑھایا اور تمام پلیٹیں خود ہی باورچی خانے میں اٹھا لے گیا۔ جب میں تنہا رہ گیا تو میز پر جا بیٹھا اور موم بتی کی روشنی میں طالب علموں کی کاپیاں جانچنے لگا۔ ابھی میں اپنے طالب علموں کی کاپیاں الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا کہ اتنے میں دروازہ کھلا۔ وہی میرا پرانا سپاہی پھر داخل ہوا۔ مجھے شبہ ہے کہ شاید اس دھندلے کمرے میں میرا وجود ایسا پُر وقار نظر آ رہا ہو گا جیسے فوج کی کمپنی کا کمانڈر بیٹھا ہے فوج چھوڑ کر آنے والا وہ سارجنٹ میجر اپنی آمد کا اعلان کر کے دروازے پر ہی اٹک گیا "کیا ہے؟" میں نے پوچھا وہ اس پر دو قدم آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ میں کاغذ کا ایک پُرزہ تھا جس پر

دن بھر کے خرچ کا حساب لکھا ہوا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ پورا حساب مجھے دکھانے لایا ہے۔ مجھے اس پہ کوفت سی ہوئی اور جی اُلجھنے لگا۔ مگر اس کے چہرے پر سنجیدگی ایسی طاری تھی جس نے مجھے آگاہ کیا کہ وہ ایک ذمّہ دار باورچی کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ میرے لبوں پر خود بہ خود مسکراہٹ آگئی۔ "تمہیں اس کی فکر کیوں پڑی ہے؟" میرے سوال کا اس نے جواب دیا: "اچھا یہی ہے کہ حساب صاف رہے۔ اگر ہم لوگ اپنا کھانا خود سے پکا لیا کریں تو آپ جانتے ہیں کیا ہوگا۔ کافی پیسہ بچ جائے گا ۱۶ ڈالر جو ہر مہینے آپ کھانے کا چارج دیتے ہیں اتنی رقم تو ہم دونوں کے لئے بھی کافی سے زیادہ ہوگی۔ مچھلی کے قتلوں اور باسی چاولوں پہ آپ کو ۱۶ ڈالر ماہوار ادا کرنے پڑتے ہیں۔ بہت ہے" اس نے کہا "مگر تم پر کام کا بوجھ بھی تو بہت پڑ جائیگا" میں نے جواب دیا: "کام کا بوجھ کیا معنی؟ چاول اور بھاجی ترکاری تیار کر لینا کیا بڑا کام ہے۔ فوجی کاموں کے مقابلہ میں جہاں دریا کے کنارے سے بڑے بڑے پتھر ڈھونے پڑتے ہیں۔ آپ؟ آپ تو سفید پوش اور تن آسان لوگ ہیں" میں نے اس کے ضرورت سے زیادہ ایماندار چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ پھر اس کے بعد میری مجال نہیں ہوئی کہ اعتراض کر سکوں۔ میں بھی راضی ہو گیا کہ اچھا تم ہی میرا کھانا تیار کر دیا کرو۔

سابق فوجی نے شنگھائی جیسے شہر کے نئے حالات سے خود کو مانوس کر لیا اور اپنے آپ کو ان ہی کے مطابق ڈھال لیا۔ گر وہ اس کی سابق وردی ابھی تک بے تکی اور اُوٹ پٹانگی معلوم ہوتی تھی۔ میں نے تجویز کیا کہ درزی کو بلائے لیتا ہوں اور ادھر تم جس طرز کا اور جس رنگ کا لباس چاہو اس سے تر شوالو۔ اس نے ہوں ہاں کی مگر جواب کچھ نہیں دیا۔ چند روز بعد اسے پتہ چلا کہ میرے پاس کہیں سے کافی بڑی رقم آگئی ہے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا آپ دس ڈالر دے دیں گے؟ شام کو وہ دس ڈالر کے نوٹ لے کر بازار گیا اور سوتی فلالین کے دو تیار سوٹ خرید لایا۔ یہ سوٹ

سن یات سین[1] کی وردی کی طرز پر سلے ہوئے تھے۔ سوٹ کے ساتھ ایک جوڑی جوتا بھی تھا پرانا جس میں نوکیں جڑی ہوئی تھیں۔ اس نے مجھے اپنی خریداری کی یہ چیزیں بہت فخر اور اطمینان کے ساتھ دکھائیں۔ "اچھا یہ وردی تمہیں اتنی کیوں بھاتی ہے؟" میں نے اس سے پوچھا۔ "اب تو تم فوج میں بھی کام نہیں کر رہے ہو۔ میری طرح سے لمبی گاؤن والا لباس کیوں نہیں پہنتے؟" اس نے جواب دیا۔ "میں ہمیشہ سپاہی ہوں سپاہی رہوں گا" چنانچہ وہ میرے دوستوں میں "فوجی افسر باورچی" کے نام سے مشہور ہو گیا۔

شروع شروع میں جب بجلی نے گڑبڑ شروع کی تو وہ زیادہ ناگوار نہیں گزری ایک دم سے بجلی غائب ہو جایا کرتی تھی اور ہر طرف گھپ اندھیرا۔ لیکن جب بار بار یہی حادثہ پیش آنے لگا تو وہ کھل گیا۔ پھر ہمارا یہ معمول ہو گیا کہ رات کے کھانے پر موم بتی رکھتے تھے۔ پھر ایک دن ہمارے فوجی باورچی کو ایک پرانا لیمپ کہیں سے ہاتھ آ گیا۔ اس نے لیمپ کی بتی کو نکونے انداز سے تراشا۔ لیمپ کو صاف کیا۔ مانجھ کر چمکا لیا۔ اور اسے میری میز پر جما دیا۔ لیمپ اتنا قدیم اور دقیانوسی فیشن کا تھا کہ شنگھائی کے عجائبات میں شمار کیا جاتا۔ مگر چونکہ مجھے خانساماں کا ضدی پن معلوم تھا میں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ پھر یہ بھی کہ لیمپ تھا کارآمد۔ اگر بجلی فیل ہو جاتی تو وہ لیمپ بڑے کام کی چیز ثابت ہو سکتا تھا۔ میں کھانے سے فارغ ہو کر اسی کو میز پر رکھ لیتا اور اپنا کام کرتا رہتا۔ لیمپ کے چمکدار اور لطیف فانوس کے سامنے، جب اس میں سے دھیمی دھیمی پیلے رنگ کی روشنی پھوٹ رہی ہو، بیٹھ کر مجھے اکثر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں کسی فوجی کمپنی کے ساتھ خواب کی دنیا میں پہنچ گیا ہوں یا بڑی قدیم عبادت گاہ یا خانقاہ کا خیالی ماحول ہے جس میں میرا قیام ہے۔ یا کوئی چھوٹی سی گاؤں کی سرائے

---

[1] چین کے رہنمائے اعظم اور جمہوریت پسند لیڈر جنھوں نے کومن تانگ قائم کی تھی۔

ہے۔ اور سرائے ایسی کہ جس کے نزدیک فوجیوں اور گھوڑ سواروں کی بٹالین کا پڑاؤ ہے
مجھے یہ سب چیزیں اچھی لگتی تھیں۔ مگر اب وہ بہت دور جا چکی تھیں اور شنگھائی کی زندگی
میں رہ کر ان تک پہنچنا ممکن نہ تھا۔ میرا روزمرہ کا جو کام تھا، ان دنوں مجھے اس کام کی
بےکیفی اور اکتاہٹ ستا رہی تھی۔ معمول یہ تھا کہ روزانہ سیدھے لکچر دینے کے لئے کالج
جانا۔ لکچر روم میں داخل ہونا۔ سامنے طالب علموں کا مجمع ہے اور میں ایک چھوٹی میز
کے سامنے کھڑا ہوں۔ نہایت سنجیدہ اور بھاری بھرکم شخصیت لئے ہوئے، مگر اسی کے
ساتھ ظاہر پرستی اور دکھاوے کا احساس ہو رہا ہے اور ضمیر اندر سے کاٹ رہا ہے۔
میں بکواس کیا کرتا تھا مگر اس بکواس میں جان ڈالنے کے لئے مختلف صاحبان فکر کے
حوالے اور مانے ہوئے لوگوں کے بیانات بلکہ ایک دوسرے کے خلاف رائے رکھنے
والوں کے بیانات بھی جڑے ہوئے ہوتے تھے۔ خود اپنی دلیلوں سے مجھ پر خواب کا غلبہ
ہو جاتا اور ایسا محسوس ہوتا کہ میں دُنیا و مافیہا سے غافل ہو چکا ہوں کہ اتنے میں کالج
کا گھنٹہ بجتا اور میری نظر کسی طالب علم پر پڑتی جو اپنے دونوں بازوؤں کے بیچ میں سر
ڈال کر سو چکا تھا۔ پھر میں چلنے لگتا تو طالب علموں کا ایک جھمگٹا میرے چاروں طرف
ہو جاتا جو لگاتار تکے بے تکے جملوں سے میرا نام میں دم کر دیا کرتے۔ بالآخر میں پھر
اپنے کمرے کی طرف بھاگ نکلتا تاکہ کچھ اور نہیں تو یہاں سکون ہی مل جائے گا جب
اس معمول سے فارغ ہو کر میں اپنے گھر پہنچتا تو نظر پڑتی کہ میز پر کتابیں، اخبار اور
مسودے بکھرے پڑے ہیں۔ طالب علموں کی مشقی کاپیاں رکھنے کے لئے مجھے جگہ
بنانی پڑتی اور میز پر سے تمام کاغذات اور کتابوں کے ہجوم کو ایک طرف سرکانا پڑتا۔
تب پھر میں اطمینان کا سانس لیتا اور خاموشی کے ساتھ طالب علموں کی کاپیوں پر نظر
دوڑانا شروع کرتا۔ اُف۔ بس ان تمام الجھاووں سے کیسا اکتا چکا تھا۔ جی میں آتی
تھی کہ ساری دنیا سے بھاگ چلو۔ اس سے تو یہ بہتر تھا کہ میں چونگی پر کہیں محرر

ہوتا اور موسلا دھار بارش کے بعد جب احاطے کے تالاب میں مینڈک ٹراتے تو اُن کا ٹر ٹر سُنا کرتا۔ اور قدیم مصنفوں اور ادیبوں کے طرز میں لکھنے کی کوشش کیا کرتا۔ کیا زندگی تھی۔

مگر اب تو میرے سامنے یہ ڈبیا نو سی لیمپ رکھا ہوا تھا اور لیمپ کی دُھندلی ٹمٹماتی روشنی میں مجھے "سابق فوجی" کی شکل نظر آئی جس پر سکون و اطمینان کا نور برس رہا تھا۔ یہی ایک ایسی ذات تھی کہ جب میں دن بھر کی مشقت سے چور ہو جاتا اور شام کو دماغ پریشان ہوتا تو وہ مجھے ایک لمحے کے لئے ساری تکان بھلا دیتی تھی۔ اس نے آپ سے آپ ہی خود کو ایک ایسے وجود میں ڈھال لیا تھا جس میں آدمی کھو جائے اور اِدھر اُدھر سے غائب ہو جائے۔

"تمہیں کوئی فوجیوں کا گیت آتا ہے؟" میں نے پوچھا

"بالکل آتا ہے" اس نے جواب دیا "سپاہی کو کیسے نہیں آتا ہوگا۔ صرف بدیسی گیت مجھے نہیں آتے اور تو سب آتے ہیں"

"اور جن گان۔ یعنی عوامی گیت؟"

"آپ کا مطلب کس قسم کے جن گان (جنتا گیت) سے ہے؟"

"کیا کئی قسم کے جن گان ہوتے ہیں؟" میں نے پوچھا

"بادل پہ بادل چلے گئے ہیں آسمان تک۔ آسمان پہ بدلیاں چھائی ہوئی ہیں" کیا آپ نہیں جانتے ان گیتوں کو؟ وہ سب کے سب بہت خوبصورت ہیں۔ بچپن میں تو وہ میری سمجھ میں نہیں آتے تھے۔ بعد میں جب میں چھاپہ مار دستے میں شامل ہو گیا تو ہم لوگ ایسے وحشی ہو گئے تھے کہ کتّے کا گوشت ملنا بھی مشکل ہو گیا تھا اور وہ بھی لذیذ اور خاصے کی غذا نظر آنے لگی تھی۔ اس وقت یہ گیت تھے جو اکثر ہمارے لبوں پر رہتے۔ اُن دنوں جتنے خوش ہم تھے شاید خدا

نے بھی اس سے زیادہ مسرت نہ پائی ہو گی۔

"اب باقاعدہ فوج میں ان کی ممانعت کر دی گئی ہے اگر آپ سیٹی بجا کر بھی ان گیتوں کی نقل کریں تو سزا دی جاتی ہے۔" اس نے جواب دیا۔

"اگر میں گاؤں تو کیا آپ مجھے قانون کا باغی سمجھیں گے۔ نوجوانی کے زمانے میں وہ گانے وہ گیت بڑا مزا دیا کرتے تھے۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ کیا وہ گیت اب بھی ان نوجوانوں کو یاد ہوں گے جو نیلے آسمان کے سائے میں پہاڑیوں پر پھیلے ہوئے ہیں۔"

مجھے اندیشہ ہے کہ جب اور اب میں زمانہ بہت بدلا ہوا ہے۔ اس نے مزے لے کر کہا۔ "جتنے اچھے رسم و رواج، برتاؤ اور اخلاق و شرافت کے دستور تھے سب کو ایک آن جانے اندھیاؤں نے صاف کر دیا ہے۔ آپ ذرا اس عجیب اور نادر زمانہ لیمپ کو ہی لے لیجئے۔ پچھلے سال جب میں آپ کے والد صاحب کے یہاں قصبے میں تھا تو وہاں سارے لیمپ اسی طرح کے ہوا کرتے تھے۔"

اس سے مجھ پر واضح ہو گیا کہ قصباتی شرفار کی طرح وہ بھی کڑوے تیل کے چراغ یا لیمپ کو شہروں کی بجلی یا گیس کی روشنی سے زیادہ پسند کرتا ہے۔

ہم خیالی پلاؤ پکانے میں وقت گذارتے رہے۔ دونوں پر نشے کی سی کیفیت طاری تھی۔ بدقسمتی سے اسی وقت مکان مالکہ کے گھنٹے نے کمرے کے باہر گلی میں نو بجائے۔ سابق فوجی نے گھنٹے کی آواز سنی۔ وہ فوراً اٹھا اور شب بخیر کہہ کر رخصت ہو گیا۔ میں نے اُسے للچایا، بلکہ اُسے ڈرایا کہ دیکھ پھر اس سلسلے میں ابھی ٹھہر کر ہم اور باتیں کریں گے۔ مگر اس نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ وہ سیدھا میری خوابگاہ میں پہنچا کہ آخری نظر ڈال کے۔ وہاں سے پھر نکلا، میرے سامنے آیا اور آتے ہی ایک سلام مارا، بلکہ آداب بجا لایا۔ ایسے جیسے کہ اب بھی ہم کسی فوجی کیمپ میں بیٹھے ہیں۔ اس کے

بعد وہ جلدی سے اپنے چھوٹے سے کمرے میں چلا گیا جو اسی کے سونے کے لئے مخصوص تھا۔

اسے اتنی جلدی کیوں تھی؟ میں نے اپنے آپ سے یہ سوال کیا۔ شاید اسے یہ خیال ہوا ہوگا کہ وہ کہیں میرے کام میں نقصان کر رہا ہے۔ یا پھر یہ سوچا ہوگا کہ میرے آرام کرنے کا وقت آگیا اسے کیوں خراب کروں۔ لمحہ بھر پہلے تو وہ اسقدر آمادہ معلوم ہوتا تھا گویا کہانیاں اس کے لبوں تک بھری ہوئی ہیں اور وہ ایک کے بعد ایک سُناتا چلا جائے گا۔ اور ایک دم اس نے گفتگو کا سلسلہ بند کر دیا اور اپنی کہانیوں کا بیان کل تک کے لئے ادھورا چھوڑ دیا۔ نو بجے رات کا وقت اس کے فوجی قانون میں اپنی قیام گاہ کے اندر پہنچنے کا وقت تھا۔ مگر یہ قانون بتایا نہیں جاتا جب وہ چلا گیا تو مجھے ایسی تنہائی محسوس ہوئی گویا کوئی اتھاہ سناٹا میرے دل کے حاشئے پہ رینگتا ہوا بڑھ رہا ہے۔ کسی کام میں پوری طرح جی لگانا محال ہو گیا۔ اپنا کام پھر سے شروع کرنے کی جتنی کوششیں میں نے کیں وہ سب مہمل اور لاحاصل ثابت ہوئیں۔

اس میں جوڑ توڑ کر لینے اور کام کے بندوبست کی راہیں نکال لینے کی ایسی بے پناہ صلاحیت تھی کہ مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے سوچا کہ اس شخص کے بارے میں کچھ لکھا جائے مگر سوال یہ تھا کہ میں اس کی پاکیزہ حسین روح کو بے جان نثر میں کیسے ڈھال دوں۔ اس کی شکل و صورت اور اس کی آواز دونوں ایسی تھیں کہ ان کی بدولت میں زندگی کو بالکل نئے رُخ سے دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ مجھے ماننا پڑا کہ اب تک جو کچھ میں جانتا تھا یا لکھتا تھا وہ سب کی سب نہایت سطحی اور بے لذت چیزیں تھیں۔ اس کی آنکھیں دو اندر دھنسی ہوئی آنکھیں، جن میں سوز کی جھلک بھی تھی کسی قدر، مگر وہ مستقبل کی اُمید سے بالکل عاری نہ

تھیں۔ ان آنکھوں پر پلکوں کا وجود نہ تھا لیکن گندمی رنگ کا غلاف ضرور تھا۔ جس میں سے وہ آپ کو جھانکتی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں دیکھنے والے کو ہمیشہ ایک بے باکی اور تپاک نظر آتا تھا مگر یہ کوئی ایسی شے نہ تھی جسے لفظوں کی صورت میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ میں زبان سے ایک لفظ کہے بغیر اس کی طرف بڑے غور سے دیکھتا۔ اور کبھی ہم لوگ آپس میں جنگ کے متعلق باتیں کر رہے ہوتے کہ باتیں کرتے کرتے ایک دم وہ لمحہ بھر کے لئے کہیں رک جاتا اور کسانوں کے ان گھروں کا تذکرہ کرتے ہوئے اس کے چہرے پر غم والم کے آثار نظر آنے لگتے۔ جن گھروں کو جلا کر مٹی میں ملا دیا گیا تھا۔ اور جن کے مویشیوں کو چھین کر ہنکا دیا گیا تھا۔ وہ لمحہ بھر غور کرنے کے لئے رکتا تاکہ دماغ کے ایک ایک گوشے سے ایسے الفاظ کھوج کر نکالے جو اس موقع کے لئے مناسب مفہوم رکھتے ہوں لیکن مصیبت یہ کہ ایسے ہی وقت الفاظ کا ذخیرہ جواب دے جاتا تھا۔ وہ چپ ہو کر منہ تکتا رہ جاتا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو خوب سمجھنے لگے تھے۔ پھر تھوڑی دیر بعد ایک شریفانہ اور نہایت ہی دلکش مسکراہٹ اس کے چہرے پر رنگینی اور سرہلاتے ہی ہمارے غم انگیز خیالات کا دھارا دوسری طرف مڑ جاتا۔ وہ کوئی مختصر سا گیت گانا شروع کر دیتا تھا۔ ایسے لمحوں میں وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا دل کتنا ہل رہا ہے۔ کئی بار ایسا بھی ہوا کہ اس نے اپنے انداز میں کوئی خاص اشارہ کیا اور مجھے اپنے چینی دوستوں کی یاد آئی۔ جس نے دل ہلا دیا کہ ان میں کیسے کیسے بے وقوف اور کیسے کیسے سچے اور معقول آدمی موجود ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ مجھے خیال آیا، دیکھو مشرق کے اُن بہت پرانے باشندوں کی امن پسند جانیں موجودہ حالات کی لہروں کے تھپیڑے کھا کھا کر جدوجہد، خلفشار اور افراتفری کی بے ہنگم دنیا کی طرف چلی جا رہی ہیں۔ غم واندوہ اور صبروضبط کے ساتھ چین کے یہ نئے انسان ایک نئی دنیا میں سمجھوتے

کی زندگی بسر کر چکے ہیں۔ مگر ان کے خوابوں میں ابھی تک ایک ایسی دنیا بسی ہوئی ہے جو روشنی سے بھرپور ہے۔ میں اس کی باتیں سنتے سنتے کبھی ایسا بے حال ہونے لگتا کہ آنسوؤں کی آمد شروع ہو جاتی اور ان آنسوؤں کو پی جانے میں مجھے بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

کبھی کبھی اندر سے میں کسی بات پر بپھرا ہوا ہوتا تھا اور ہر بات مجھے کاٹنے کو دوڑتی تو میں اس سے کہتا کہ جاؤ۔ یہاں میرے کمرے میں بیٹھے ہوئے کیا مکھیاں مار رہے ہو کوئی تفریح کرو۔ ایسے موقع پر وہ مجھے آنکھ بھر کے دیکھتا تھا اور کچھ کہے بغیر وہاں سے ٹل جایا کرتا تھا۔ پھر میں فوراً اسے آواز دے کر واپس بلاتا۔ "اچھا دیکھو تم تھیٹر جاؤ گے؟" معذرت کے انداز میں صرف اتنا پوچھتا اور اسی کے ساتھ کچھ ڈالر اس کے حوالے کر کے کہتا۔ لو یہ روپیہ لے لو۔ اور جیسے جی چاہے خرچ کر ڈالو۔ وہ اس پر ایک جبریہ مسکراہٹ کے ساتھ میرا منہ تکنے لگتا۔ آہستہ سے وہ رقم لے لیتا اور پھر زینے سے نیچے اترنے کے لئے مڑ جاتا تھا۔ اپنے معمول کے مطابق میں سونے کے لئے بستر پر جانے سے پہلے آدھی رات گئے تک کام کرتا رہا۔ میں نے آہٹ سنی کہ سابق فوجی خانساماں روانہ ہونے سے پہلے آہستہ آہستہ دروازہ کھول رہا ہے دس بجے کے قریب دروازے کی ہلکی سی چرچراہٹ نے مجھے آگاہ کر دیا کہ وہ واپس آ گیا۔ مجھے امید تھی کہ تھیٹر جائے گا تو وہاں لطف اندوز ہوگا، تماشہ دیکھے گا، شراب اڑائے گا جوے میں پیسے لگائے گا اور سوچے گا کہ رقم کچھ کم نہیں تھی۔ وہ واپس آیا تو میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ دوسرے دن جو کھانا کھانے بیٹھتا ہوں تو پلیٹ میں نہایت عمدہ پکا ہوا مرغ رکھا ہے۔ میں نے محسوس تو کیا مگر پوچھا نہیں کہ مرغ کہاں سے آیا ہے۔ ہم دونوں مسکرائے اور مجھے اس کی گندمی آنکھوں میں وہ الفاظ لکھے ہوئے نظر آئے جو اس نے ادا نہیں کئے تھے۔ میں نے کہا "آؤ۔ کچھ پی ڈالیں۔ تم تو

بہت پیتے ہو۔ کیوں ہے نا؟" اس بات کا ذرا جھجک کے ساتھ اور کسی قدر مزے دار مسکراہٹ کے ساتھ اس نے جواب دیتے ہوئے کہا، دیکھئے میں آپ کے لئے خوشخبری لایا ہوں۔ یہاں جتنے شراب بیچنے والے ہیں سب کے سب الکوہل بیچتے ہیں۔ میں کئی دوکانوں پر گیا، معلوم کرتا پھرا۔ بالآخر ایک دوکان مل گئی۔ اس کا مالک میرے گاؤں کا ایک آدمی ہے۔ اس نے مجھے بڑی عمدہ چیز دی ہے۔ چاول کی شراب یہ کہہ کر وہ زینے سے نیچے کی طرف لپکا اور فوراً سفید شراب کی چھوٹی سی بوتل سنبھالے ہوئے آیا۔ اس نے میرا آدھا پیالہ بھر دیا کہ ذرا اسے چکھئے۔ بہت نہیں ہے۔ اگرچہ میں شراب، کباب سے پرہیز ہی کرتا ہوں لیکن اس وقت میں چاہتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ اس کی خواہش پوری کردوں۔ اس نے پھر وہی پیالہ بھرا اور اسے ایک ہی گھونٹ میں اُتار گیا۔ شراب کی ترش اور شیریں مہک سے وہ خوب لطف اٹھانے لگا۔ مسکرا کر بغیر کچھ کہے اس نے بوتل اٹھائی اور نیچے چلا گیا۔ دوسرے دن کھانے پر پھر ہمیں مرغ ملا۔ اُن دنوں شنگھائی جیسے شہر میں مرغ کی قیمت کل ایک ڈالر ہوا کرتی تھی۔

میرے سابق فوجی کو اس کالج سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی جہاں میں پڑھایا کرتا تھا۔ ایک بار اس نے مجھ سے پوچھا کہ یہ لڑکے جو کالج سے بی۔ اے کر کے نکلیں گے وہ آگے چل کر کیا بنیں گے؟ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے خیال میں وہ سب کے سب بی۔ اے کرنے کے بعد مجسٹریٹ صاحب ہونے والے ہیں۔ وہ یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ مجھے تنخواہ کیا ملتی ہے اور کیا وہ بھی فوج کی تنخواہوں کی طرح جو خانہ جنگی کے زمانے میں ایک دم گھٹتی یا بڑھتی رہتی تھیں، کم وبیش ہوا کرتی ہے اسے بس اتنا معلوم کرنا تھا کہ کتنے آدمی مجسٹریٹ ہونے والے ہیں اور یہ کہ میری تنخواہ گذر کے قابل ہوتی ہے یا نہیں۔ اس کی تمام تر دلچسپیوں کا مرکز بس میرا وجود تھا۔ صرف

مہربانی اور شفقت کے خیال سے وہ روز بروز میرے ذاتی معاملات کے بارے میں متلاشی ہوتا گیا۔ شروع شروع میں تو وہ میری ہر بات سے اتفاق کر لیا کرتا تھا اور بے چون وچرا مان لیتا تھا۔ بعد میں وہ کسی نہ کسی عذر سے میرے وقت میں دخل اندازی کرنے لگا۔ میری بے پروائی کا بھی وہ کچھ خیال نہ کرتا اور ایسا نظر آنے لگا کہ وہ میری خاطر اپنی ذات پر ہر قسم کے فرائض اور ہر طرح کے کام کی ذمّہ داری لے چکا ہے۔ اب مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اسے سخت آواز سے جھڑک دوں یا زینے کے نیچے زبردستی دھکا دوں۔ وہ بہت کم بولتا تھا۔ اگرچہ وہ کبھی نادیدہ اور خیالی دشمنوں کی شکایت بھی کر لیتا تھا۔ مثلاً یہ کہ میرے برتاؤ میں جو ان دنوں ناگواری اور سختی آگئی ہے اس کے اسباب فلاں فلاں ہو سکتے ہیں۔ اس کے نزدیک انصاف کا تقاضا کبھی یہ گوارا نہیں کر سکتا تھا کہ میری عمر کا آدمی اور کنوارا ہے۔ کم سخنی کے باوجود وہ نوبت آگئی کہ جتنا زمانہ گزرتا جاتا تھا میں اس کے لا متناہی باتونی پن سے پریشان ہوا جاتا تھا۔ ایک بار میں نے اس سے تنگ آکر کہہ دیا کہ نہ تو معززین کی طرح میرے پاس دولت اور مرتبہ ہے اور نہ طالب علموں کی طرح نوجوان یا ہونہار ہوں اس لئے اب مجھے شادی کے معاملے میں گیا گزرا سمجھو۔ میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ اب اس بارے میں کوئی قدم نہیں اٹھاؤں گا۔ مجھے امید تھی کہ اس کے بعد وہ میری لاپروائی پر اپنی نکتہ چینی بند کر دے گا۔ لیکن الٹا اثر ہوا۔ وہ میرے ان ملنے جلنے والوں پر نظر رکھنے لگا جو صنفِ نازک سے تعلق رکھتے تھے۔ مثلاً اگر کوئی طالب علم لڑکی یا کوئی خاتون دوست آجائیں تو وہ فوراً لپک کر باہر جاتا اور صاف ستھرے طشت میں پھل رکھ کر سامنے آتا۔ پھر وہاں سے خود ہی کھسک جاتا اور نیچے جا کر یا تو چپ چاپ کھڑا ہو جاتا یا ہماری گفتگو کی بھنک پڑنے کے لئے کان لگائے رکھتا۔ اور جب میں ملاقاتی کو رخصت کرنے اٹھتا تو وہ ہمیشہ وہیں پر دبکا ہوا نظر آتا

تھا حالانکہ ظاہر ایسا کرتا تھا جیسے کوئی چیز ڈھونڈھنے چلا آیا ہو۔ وہ اس لڑکی یا خاتون پر اڑتی ہوئی نظر دوڑاتا اور اس کے چلے جانے کے بعد مجھ سے پوچھ گچھ کیا کرتا یہ کون تھیں؟ کہاں رہتی ہیں؟ کیا کرتی ہیں؟ ان کے متعلق میری کیا رائے ہے؟ خود اپنی طرف سے بھی اس کی مسکراہٹ، گفتگو، آداب اور سلیقے پر تبصرہ کرتا جاتا تھا۔ اور اس سے بھی بڑھ کے بے تکی باتیں وہ ہوتی تھیں جب وہ چینی علم قیافہ کے استعمال پر اُتر آتا تھا۔ آواز، ناک نقشہ، جسم کی بناوٹ اور چال ڈھال دیکھ کر ہی وہ یہ نتیجے نکال لیا کرتا تھا کہ فلاں عورت نیک اور شریف یا فائدہ مند ہے یا نہیں۔ فلاں عورت کی عمر کتنی طویل ہوگی اور اس کی ذات بابرکت ہے کہ نہیں۔ اول اول تو جو باتیں اس کے دماغ میں بھنبھنایا کرتی تھیں ان کی طرف میں نے کوئی خاص توجہ نہیں کی، لیکن بعد میں مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ میرے یہاں صنفِ نازک میں سے جب کوئی موجود ہوتا ہے تو فوجی خانساماں کے رویہ میں کوئی خاص تبدیلی آجاتی ہے۔ یہ بات ذرا عجیب سی تھی۔ جب وہ اس کی کوشش کرتا تھا کہ مجھے کسی خاص عورت سے شادی کر لینے کی ترغیب دے تو وہ اپنی سادگی اور معصومیت میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ فرض شناسی کے ساتھ کوئی مبارک خدمت انجام دے رہا ہے اور کارِ خیر ادا کر رہا ہے۔ اس کے تصوّر میں شاید وہ خاص لمحہ بھی آجاتا ہوگا جب وہ بازار سے نئی نئی خریدی ہوئی چست وردی ڈاٹے ہوئے مشرقی ایشیا ہوٹل کے پھاٹک پر کھڑا ہے اور میری شادی کے جشن میں آنے والے مہمانوں کا خیر مقدم کر رہا ہے۔ بلکہ تعجب نہیں جو وہ تصور ہی تصور میں یہاں تک پہنچ جاتا ہو کہ وہی وردی اس کے جسم پر کسی ہوئی ہے اور وہ میرے بچے کو اپنے ساتھ لئے ہوئے باغیچے میں کھیلنے اور ٹہلانے جا رہا ہے۔ چھوٹے بچے کے بدن پر بھی وردی کا سا لباس ہے۔ اسی پر بس نہیں ہے۔ اس نے اور بھی خیالی گھوڑے دوڑاتے ہوں گے۔

اس نے سوچا ہوگا کہ شاید میں خوب اعزاز و مرتبے کے ساتھ اپنے خاندان کے ہمراہ جنم بھومی کے قصبے میں داخل ہو رہا ہوں۔ وہ میری جلو میں چل رہا ہے۔ ایک عالی شان گھوڑے پہ سوار۔ اور شہر کے دروازے میں پہلے اسی کی سواری داخل ہوتی ہے۔ میرے دوست اور رشتہ دار جو میرا خیر مقدم کرنے اور سلام دعا کرنے آئے ہیں اُن کے سلاموں کا جواب دیتا جا رہا ہے۔ سارا قصبہ میری آمد کی خوشیاں منا رہا ہوگا اور وہ اس جشن کے جلوس میں گھوڑے کو مہمیز کرے گا اور ڈلکی چال کے ساتھ آگے آگے بڑھتا جائے گا۔ ..... اب سے دس سال پہلے اسی قسم کی امیدیں اسے میرے والد صاحب سے رہی تھیں۔ اس کے بعد میرے بڑے بھائی سے مگر ان کی تمام امیدوں پہ پانی پڑ چکا تھا۔ اب اس کی اُمیدوں کی آخری آماجگاہ میری ذات تھی۔ جیسے ڈوبنے والے کی آخری اُمید گاہ کنارے کی گھاس ہوتی ہے۔ بہت زمانے کی بات ہے کہ ہمارا خاندان ایک خوش حال گھرانہ سمجھا جاتا تھا اور زوال کب شروع ہوا مجھے ٹھیک ٹھیک معلوم نہیں۔ سابق فوجی کا بیان ہے کہ اس کے آقا یعنی میرے والد صاحب منگولیا اور شمالی مغربی علاقوں میں کافی ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد ناکام اور نامراد ہو کر وطن میں واپس آ گئے تھے۔ گھڑ سوار ڈاکوؤں سے کہیں ان کی ٹکر ہو گئی تھی۔ اور ان معرکوں میں ان کے جسم پہ ایسے زخم لگے جن کی وجہ سے والد صاحب کی ریڑھ کی ہڈی اور پہلوؤں میں مستقل درد رہ گیا تھا۔ اس مستقل بیماری نے انھیں وقت سے پہلے بوڑھا کر دیا۔ فوج کی خدمات سے سبکدوش ہونے کے بعد بھی وہ کرنل کے عہدے پہ سرفراز رہے اور انھوں نے اپنے صوبے کی فوج کی ڈاکٹری شعبے کو اپنی خدمات پھر بھی پیش کر دی تھیں۔ میرے بڑے بھائی بھی والد صاحب کے نقش قدم پہ چلے اتفاق ایسا کہ وہ چوں کہ اِدھر سے اُدھر یوں ہی گھومتے پھرے تھے اس لئے ایک عرصے یک ان کے طور طریقوں میں ایک طرح کا اُجڈپن آگیا تھا اور اکھڑ ہو گئے تھے

یہ عادت شمالی مشرقی صوبوں کی خصوصیات ہیں۔ اس کے علاوہ شنگھائی کے بیوپاری طبقے کی عادات یعنی شور وشغب اور دُھنا دُھن خرچ کرنا، حد سے گزر جانا بھی ان کی طبیعت میں جگہ پا گئی تھیں۔ وہ بھی اپنے وطن کو لوٹے بالکل خالی ہاتھ اور وہاں انھوں نے پیشہ ور آرٹسٹ کا کاروبار اختیار کر لیا۔ ایک میرے چھوٹے بھائی کا معاملہ سب سے مختلف تھا۔ سابق فوجی جب اس کا ذکر کرتا تو افسوس کے ساتھ کہ چھوٹے بھائی سے کبھی اس کی ملاقات نہیں ہوئی۔ اس کے سنِ شعور کو پہنچتے پہنچتے انقلابی دور شروع ہو چکا تھا۔ وہ کینٹن میں وھامپو کی فوجی تربیت گاہ میں داخل ہو گیا۔ میرے چھوٹے بھائی میں بڑی جگرداری اور جوان خونی کی گرمی موجود تھی وہ ایک پلٹن کا کمانڈر ہو گیا اور صرف چند سپاہیوں کا دستہ لے کر ہوپیہہ اور کیانگسی میں نہایت جواں مردی اور دلیری کے ساتھ زبردست مقابلے کرتا رہا۔ لیکن ۱۹۲۷ء کا انقلابی معرکہ ختم ہوتے ہی اس نے نہ جانے کیوں ایک دم فوجی زندگی سے ہاتھ اٹھا لیا۔ اور شہری زندگی پھر اختیار کر لی۔ وہ خوں ریزی اور بد عنوانی سے چڑنے لگا اور انسانی زندگی کی جتنی اور بے شمار حماقتیں ہیں ان سب پر کفِ افسوس ملنے لگا۔ سب کے خلاف اس میں بیزاری پیدا ہو گئی۔ اب وہ آنریری اسٹاف افسر کی حیثیت سے بس بیکار پڑا رہتا تھا۔ یہ عہدہ بہت نیچے کا تھا جس پر قناعت کر کے وہ تنخواہ تو وصول کر لیتا تھا لیکن اس پر کوئی ڈیوٹی عائد نہیں تھی۔

میں نے نہ تو والد کا راستہ اختیار کیا اور نہ اپنے بھائی کا۔ اسی وجہ سے میرے سابق فوجی کو یہ اُمید قائم رکھنے کا موقع ملا کہ شاید میرا مستقبل تابناک ہو گا۔ یہ اُمید ایک ایسا خواب تھی جس میں اس کی اپنی کوئی غرض شامل نہ تھی۔

سابق فوجی کے سامنے مجھ پر ایک سوز اور غیرت کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی مگر میری اتنی جرأت کبھی نہ ہوئی کہ اس نے جو خوابوں کے گھروندے تعمیر کر رکھے

تھے انھیں صدمہ پہنچاؤں۔ ایک بار میں نے اس سے نہایت بے باکی سے کہا کہ مجھے
ایک لکچرار اور ادیب ہونے میں مزا آتا ہے۔ یہی پیشہ پسند ہے۔ اس کے سوا کچھ نہیں
چاہیئے۔ مگر اس کی نظر میری زندگی کی صرف سطح تک آکر رہ جاتی تھی اس سے آگے
جو نامعلوم زبردست گہرائیاں ہوسکتی ہیں ان کے متعلق وہ شک وشبہ میں گرفتار تھا۔

اُن دنوں ایک لڑکی تھی انقلابی، جو مجھ سے اکثر ملنے آیا کرتی اور کافی دیر
تک میرے یہاں ٹھہرتی تھی۔ اکثر وہ اپنے ہمراہ اپنی تحریریں بھی لایا کرتی تھی اور موسم
چاہے کیسا ہی ہو وہ ایک نیلے رنگ کا گاؤن پہنے رہتی تھی۔ اسے مجھ پر بڑا پکا بھروسہ
تھا اور پوری طرح مجھے ایماندار اور قابل اعتماد آدمی سمجھتی تھی۔ کچھ دنوں کے لئے
سابق فوجی نے اپنی تمام تر توجہ اسی پر لگادی۔ وہ اس کے ساتھ ماں کا سا برتاؤ کرنے
لگا اور کوئی بات چاہے وہ کیسی ہی خفیف کیوں نہ ہو اس کی توجہ سے بچ کر نہیں نکلتی تھی۔

جب وہ میری خاتون دوست آجاتی تھی تو وہ کسی نہ کسی کام کے بہانے
تھوڑی دیر کمرے میں اِدھر سے اُدھر گھومتا پھرتا کہ شاید میں اُسے متعارف کرادوں گا
میں اسے تکلیف پہنچانے کے لئے بالکل آمادہ نہ تھا۔ میں نے اپنی نوجوان دوست
سے اس کا ذکر کر رکھا تھا کہ وہ ایسا زمانہ دیکھ چکا ہے۔ بڑا پُر خلوص۔ سیدھا اور
ایمان دار آدمی ہے۔ آہستہ آہستہ وہ بھی اس سے خلوص برتنے لگی۔ زمانے کے
نرم وگرم کا مارا ہوا سابق فوجی جس کے دل کو قتل وغارت اور قحط ومصائب
نے پتھر کر دیا تھا دھیرے دھیرے موم کی طرح پگھلنے لگا۔ اور نہ جانے کس ان جانے
سبب نے اُسے اس نتیجے پر پہنچا دیا کہ اگر میں نے اس سے شادی کا رشتہ نہ جوڑا
تو میں بہت بڑے جرم کا ارتکاب کروں گا۔ جب کبھی ہم دونوں تنہا ہوتے تو وہ میرے
پاس بیٹھ کر اس معاملے پر نہایت سنجیدہ قسم کی بلکہ کہنا چاہیئے ملامت کرنے کے انداز
کی بات چیت کیا کرتا تھا۔ شروع شروع میں جب وہ اس سے گفتگو کرتی تو وہ

جھینپ جاتا تھا مگر بعد میں جب لڑکی اس سے پچھلی زندگی کے بارے میں سوال کرنے لگی تو وہ کھل گیا۔ بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ مسکرا کر اور نہایت تمیز کے ساتھ وہ باتیں کرنے لگا۔ مگر اب بھی ان باتوں میں کہیں نہ کہیں تکلف کا رنگ جھلکتا تھا۔ زیادہ عرصہ نہ گزرنے پایا تھا کہ بے تکلفی بڑھنے لگی اور اس کی وجہ سے اس کی ہمت بڑھتی گئی۔ وہ اس بات کی کوشش کرنے لگا کہ بات چیت کے اصل موضوع کو گھما پھرا کر کسی طرح میری روزمرّہ کی زندگی کی طرف لے آئے اس نے لڑکی سے التجا کی کہ آپ انھیں سمجھائیے کہ وہ زندگی کا طرز کسی قدر بدل دیں مثلاً یہ کہ کام کم کیا کریں۔ غذا کا خیال رکھیں۔ بھلے معزّز آدمیوں کے سے کپڑے پہنا کریں۔ یہ باتیں اس نے خود میری موجودگی میں کر ڈالیں۔ وہ ذکر کرنے لگا کہ دیکھئے آپ کے والد کیسے شریف، مہذب اور باحیثیت آدمی تھے۔ میرے اہلِ وطن میں میرے بھائیوں کی کتنی عزت تھی۔ میری والدہ کتنی شریف اور نیک طینت معزّز خاتون تھیں۔ اس تمام دوران میں وہ انتہائی بھدے طریقے سے ہمیں یہ جتانے کی کوشش کرتا رہا کہ نوجوان لڑکی کو اپنے شوہر اور اپنے خُسر کے ساتھ کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ اس کی گفتگو کا دائرہ بڑھتے بڑھتے مبالغے کی حد کو چھونے لگا تھا اور وہ دھیمی آواز سے گفتگو کے دوران بار بار میری طرف دیکھ کر یوں ہی مسکرا دیتا کہ کہیں میں اُکتا کر اُس کے بیان کی اصلاح نہ کر ڈالوں جیسے ہی اس نے محسوس کیا کہ وہ نوجوان لڑکی ہمدردی کی طرف مائل ہو گئی ہے۔ تو اس نے فوراً دل میں سوچا کہ ہاں۔ میرا منشا اور غرض پورا ہوا چاہتا ہے۔ پھر اس نے میری طرف ایک اطمینان بھری نظر ڈالی اور اجازت مانگنے لگا کہ میں نیچے جاتا ہوں اور چائے ناشتہ وغیرہ تیار کر کے لے آتا ہوں۔ سیڑھیوں پر اس کے پھرتیلے قدموں کی آہٹ بتا دیتی تھی کہ وہ بہت مطمئن ہو کر اور دل کا بوجھ ہلکا کر کے گیا ہے۔

ایک دن اس نے دیکھا کہ میں اپنی میز پر جھکا ہوا والدہ کو خط لکھ رہا ہوں۔ اب

اس کی جستجو بہت تیز ہو گئی۔ اس نے پوچھا کہ کیا خط میں اس نوجوان خاتون کا بھی ذکر میں نے کیا ہے؟ "بہت اعلیٰ درجے کی لڑکی ہے"۔ اس نے صرف اتنا کہا اور میں سمجھ گیا کہ اس اعلیٰ درجے کے لفظ کا مطلب ہے بڑی دل کش اور اعلیٰ درجے کی چوڑی میں نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ بھویں تان لیں اور "ہونہہ" کہہ کر ٹال گیا اور وہ جھلا کر وہاں سے چل دیا۔ اس کی آنکھیں بظاہر یہ کہنا چاہتی تھیں "خیر۔ یہ تو صرف مذاق تھا؟ صرف خیر خواہی کے خیال سے میں نے کہا۔ آپ کچھ خیال نہ کیجیے گا" وہ کمرے کے بالکل آخری کونے میں جا بیٹھا۔ جیسے اُسے خطرہ ہے کہ میں پتھر کی دوات اس کے سر پہ نہ کھینچ ماروں۔

ایک دن وہ لڑکی ایسے وقت آئی جب میں باہر گیا ہوا تھا۔ سابق فوجی نے اس کا خیر مقدم کیا اور اس طرح پیش آیا جیسے وہی تنہا اس سے گفتگو کا مجاز ہے (بعد میں مجھے اس کے اشاروں سے معلوم ہوا کہ وہ لڑکی کے ساتھ نہایت نرمی اور انکساری مگر ساتھ ہی بے تکلفی سے پیش آیا تھا جو کسی ملازم کو اپنی مالکہ کے سامنے زیب دیتی ہے) بالآخر جب لڑکی نے محسوس کیا کہ خبر نہیں میں کب لوٹوں تو وہ واپس چلی گئی۔ جیسے ہی میں گھر واپس آیا اس نے لڑکی کی آمد اور گفتگو کا حال سُنانا شروع کر دیا۔ اور اسی کے ساتھ یہ بھی بتایا کہ اس نے بیچ میں کیسی کیسی بے تعلق باتیں کر ڈالی تھیں۔ ابھی بات ہو رہی تھی کہ اتنے میں وہ لڑکی پھر آ پہنچی۔ رات کے کھانے کا وقت قریب ہو چلا تھا۔ اس نے اپنے طور پہ یہ سوچ لیا کہ میں شاید لڑکی سے بھی یہیں کھانا کھانے کے لیے کہوں گا۔ اس نے فوراً پھرتی دکھائی اور خوش خوش زینے کے نیچے اُتر گیا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد وہ کئی پلیٹیں سنبھالے ہوئے آ پہنچا جن میں حیرت انگیز حد تک ایک سے ایک مزے دار کھانا موجود تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ اس نے اتنا عمدہ کھانا پکانا کہاں سے سیکھ لیا۔ نمک مرچ کے چٹ پٹے کھانے کے بجائے اس نے ہر چیز شکر

سے تیار کی تھی جو اس لڑکی کو پسند آئے۔ یہاں تک کہ مچھلی کے سالن میں بھی شکر اور کھٹاس کی چاشنی دی ہوئی تھی۔

جب کھانے سے فراغت ہوئی اور دسترخوان ہٹایا گیا تو وہ پھل پھلواری لے آیا جس میں کچھ سیب تھے اور گرم اُبلی ہوئی کافی۔ اگرچہ اس کے بعد کسی اور شے کی ضرورت نہ رہ گئی تھی۔ مگر پھر بھی وہ رخصت ہونے سے پہلے وہیں منڈلاتا رہا۔ اور پھر چونکہ اس پر جذباتی کیفیت طاری تھی اس لئے خود سے پینا شروع کر دی۔ جب شراب پی چکنے کے بعد اس نے مدہوش آنکھیں کھولیں تو اس میں اس کے مالک اور مالکہ کی تصویر جھلک رہی تھی بلکہ عجب نہیں جو اس نے جامِ شراب کی تہہ میں صاحبزادے کا عکس بھی دیکھ لیا ہو۔ وہ بچہ جو خود بھی اس کا آقا ہو گا۔ نہایت ٹھاٹھ دار فوجی وردی میں ڈٹا ہوا گھوم رہا ہو گا اور غیر ممالک کے بچوں کی طرح اسے سڑک پر نظر آئے گا۔ یہ ننھا سا خیالی آقا اپنے دو چھوٹے چھوٹے پیر جھکاتا ہوا جا رہا تھا۔ ان پیروں میں چمڑے کے بالکل نئے جوتوں کی بہار ہو گی۔ آگے آگے وہ اکڑ کر چلتا ہو گا اور پیچھے پیچھے اس کا وفادار خادم یعنی سابق فوجی بذاتِ خود۔ جب اسے یہ معلوم ہوا ہو گا کہ وہ نوجوان لڑکی میرے ساتھ ہی شب کا کھانا کھائے گی تو اس نے اپنے طور پر خوابوں کے کیسے کیسے گھروندے بنا لئے ہوں گے۔ مگر اس سے بڑھ کر اور درد ناک بات کیا ہو سکتی تھی۔

وہ نوجوان دوست مجھ سے اس رات صرف یہ کہنے آئی تھی کہ میں اور میرا چاہنے والا ہم دونوں اگلے مہینے پیکنگ جا رہے ہیں اور وہاں شادی کر لیں گے۔ شادی کا لفظ نہ جانے کیسے اس سابق فوجی کے کان میں پڑ گیا۔ اس کے کان ہر وقت لیسے کھڑے رہتے تھے جیسے جنگی گھوڑوں کے کان ہوتے ہیں۔ اور شادی کا لفظ سن کر اس نے مزید تحقیقات کے بغیر اپنے جی ہی جی میں سوچ لیا کہ ایک زمانے سے جو اُمید یں وہ لگا تا رہا تھا اب ان کے انجام کو پہنچنے کا وقت آگیا ہے۔ لڑکی کے چلے جانے کے بعد

میں اپنے لکھنے پڑھنے کی میز پر بیٹھ گیا اور مجھے اس خوش خبری پر بڑی خوشی ہونے لگی مگر خوشی کی تہہ کے نیچے ضرور کوئی نہ کوئی اداسی کا سا احساس بھی ہوگا۔ ایک دم میں نے دیکھا کہ بالکل میری ناک کے نزدیک کوئی سُرخ گلال جیسا چہرہ سامنے آیا۔ میں مڑا تو دیکھتا ہوں کہ وہ شراب کے نشے میں چُور ہے۔

دیکھو۔ آج تو تم بہت چور ہو؟ ہے نا؟ اور یہ تم نے اتنے بہت سے کھانے کہاں سے پیدا کر لیئے تھے؟ میری مہمان آج تمہارے کھانوں کی بڑی تعریف کر رہی تھی۔

وہ میری گفتگو کے دوران ہنستا رہا۔ اور اب بلّی کی طرح کھلاڑ پن پر اُتر آیا۔

"آج تو میں بہت خوش ہوں" اُس نے کہا۔

"ہاں تمہیں خوش ہونا ہی چاہیئے"

وہ غیر معمولی طور پہ مزے میں تھا۔ اور مجھ سے اُلجھنے کے لئے آمادہ نظر آتا تھا۔

"آپ کا کیا مطلب کہ خوش ہونا چاہیئے۔ کیوں؟ آخر۔ مجھے اتنی خوشی کبھی نہ ہوئی تھی۔ آج تو میں نے سفیدے کی آدھی بوتل اُڑا دی۔

"اچھا۔ یہ بات؟ تو پھر کل اور خرید لانا۔ ہمیشہ ایک بوتل کم سے کم تیار رکھنی چاہیئے۔ کچھ بھی ہو لیکن تمہیں تو پینے کے لئے ضرورت ہوگی ہی۔ چاہے یہاں اور ہر ایک چیز کا قحط پڑا رہے۔ تمہیں کیا۔"

میں نے زندگی میں کبھی اتنی شراب ایک دم نہیں پی ہے۔ مجھے خوش ہونا ہی چاہیئے۔ کیا میں ہمیشہ اُداس یا رنجیدہ نظر آتا ہوں۔ جب مجھے آپ کے والد صاحب اور ان کی بدقسمتی کا خیال آتا ہے تو بھلا میں خوشی کیسے محسوس کر سکتا ہوں؟ اور جب مجھے آپ کے بڑے بھائی صاحب اور ان کی صحت بگڑ جانے کا اندیشہ رہتا ہے تو ..... میں نے آپ کے چھوٹے بھیا کو تو دیکھا ہی نہیں .... لیکن وہ آدمی نہیں ہے چیتا ہے جس پر سنہری دھاریاں پڑی رہتی ہیں۔ اور آگ کا سا شعلہ خو۔ مگر پھر

بھی ہے بڑا بھلا مانس۔ ایک بار میں نے سوچا کہ میں بھی پیچھے پیچھے دشمن کی صفوں میں گھس جاؤں گا۔ ہاتھ میں بندوق لئے، خار دار تاروں کو اور تمام رکاوٹوں کو پھلانگتا ہوا پہنچوں گا اور ان پوربیوں کو للکارتے ہوئے ——— ان کے سینے میں رائفل کی سنگین پیوست کردوں گا...... ان سے یہ بھی سیکھنے والا تھا کہ دستی بم کیسے پھینکے جاتے ہیں جو سات سکینڈ کے اندر اندر جہاں پڑ جائیں وہاں چیتھڑے اُڑا دیتے ہیں...... مگر دیکھئے کیا ہوا۔ آپ کو تو معلوم ہے کہ وھامپو میں جتنے چوتھے درجے کے افسر گئے تھے سب کے سب لنگٹ اُن کی جنگ میں کام آ گئے۔ دو مہینے بعد ایک شخص مجھے ملا جس نے بتایا کہ اب تک سڑے ہوئے جسموں سے بدبو آ رہی ہے۔ افوہ ——— نہ جانے قسمت کا کون سا مبارک تارہ تھا جو چھوٹے بھیا کے سر پہ چمک رہا تھا (کہ وہ بچ گئے)۔ ایسے دلیر آدمی ہیں کہ وہ جنگلی سور کا شکار کرتے گھوڑے پہ جاتے ہیں۔ ہیرو ہیں سچ مچ کے مجھے غم اس بات کا ہے کہ ایسے آدمی کو ڈویژن کمانڈر کے عہدے تک پہنچنا میسر نہ آیا۔ آپ کو دیکھ کر مجھے کیا خوشی ہوگی۔ آپ کی صحت تک تو ٹھیک نہیں رہتی آخر آپ سے یہ کیوں نہیں ہوتا کہ آپ......

"اچھا تم اٹھو اور جا کے آرام کرو۔ مجھے بہت کام کرنا ہے ابھی۔"

"ہاں تو مجھ پہ آپ کو بھروسہ نہیں ہے۔ یہی بات ہوگی۔ آپ مجھے ابھی تک اجنبی ہی سمجھتے ہیں۔ بوڑھے گھوڑے کے سے کان ہیں میرے۔ کوئی بات میری نظر سے بچ کر نہیں جا سکتی۔ مجھے سب خبر ہے۔ شادی کا جشن ہوگا تو ہیوں گا میں خوب جی بھر کے۔ اور آپ راز چھپائے جائیے۔ اچھا یہی بات ہے تو میں کل اپنا بوریا بستر لپیٹتا ہوں اور یہاں سے سدھارتا ہوں۔"

"مجھے بتاؤ تم نے سنا کیا ہے؟ کیا میں نے کبھی کوئی بات تم سے چھپائی ہے؟"

"مجھے سب خبر ہے .... سب خبر ہے .... بس - میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں .... آپ کو کیا معلوم کہ میرے جی پر کیا گزرتی ہے!"

ایک دم وہ پھوٹ پڑا - عمر رسیدہ آدمی - مضبوط اور ہٹ کا پکّا فوجی ایک ننھے بچے کی طرح آنسوؤں سے رونے لگا - مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے آنسو مسرت اور اطمینانِ قلب کے آنسو ہیں - یقیناً وہ اپنی جگہ یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ میں اس نوجوان لڑکی سے جو ابھی آئی تھی بہت جلد شادی کرنے والا ہوں -

میں نے طے کر لیا کہ اب اس سے یہ بات چھپانا ناممکن ہے - اسے پورا یقین تھا کہ اس کی امداد کی ضرورت نہیں پڑے گی - اور اب ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ ہر ایک کام کا انچارج بننے والا ہے - اب اس کی نظر میں وہ مثالی عورت جچ چکی تھی جو اس کی مالکہ بننے والی ہے - اور اب جبکہ اس کے پرانے خواب تعبیر کی صورت میں ڈھلتے نظر آ رہے وہ خوشی کے آنسوؤں کو ضبط نہ کر سکا - میں اس کے جذبات کو سمجھ گیا ایک دم اس نے اپنی بالوں میں ڈھکی ہوئی اور بھری بھری مضبوط کلائیوں سے آنسو پونچھ ڈالے اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ کیا میں نے تاریخ وغیرہ طے کر لی ہے اور ساتھ ہی بولا کہ شبھ گھڑی دیکھنے کے لئے آپ اس اندھے جوتشی سے ضرور مشورہ لے لیجئے کیوں کہ وہ ایسے نازک معاملات میں بہت مفید اور کارآمد ہے -

اب مجھے الجھن ہوئی - میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی باتوں پر ہنس پڑوں یا زور سے چیخ ماروں - اسے ڈانٹ دینے کی ہمت مجھ میں نہیں تھی - اور پھر یہ بھی ہے کہ اس وقت شراب کے نشے میں نہیں تھا - صرف اتنی بات تھی کہ اسے پکا یقین تھا کہ مجھے یہ بات اس سے چھپائے رکھنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا - اس نے تجویز کیا کہ میں اپنے ان رشتہ داروں اور عزیزوں کو فوراً تار دیدوں جو یہاں سے ہزاروں میل کے فاصلے پر رہتے ہیں - اس نے سچے دل کے ساتھ اس نوجوان لڑکی

کی تعریف وتحسین شروع کر دی اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ چند روز پہلے اس نے جو لڑکی سے بات چیت کی تھی اس بات چیت میں وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا ہے کہ میری والدہ کی نظر میں یہ لڑکی لاجواب دلہن رہے گی۔

میں نے اسے دلاسا دینے کی کافی کوشش کی اور اصل واقعہ تھا وہ پورا پورا کہہ سنایا۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ مجھے غور سے دیکھتا رہا اور بڑی توجہ سے سنتا رہا پہلے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ ہوا کیا پھر جب سمجھ میں آگیا تو وہ ہکا بکا رہ گیا جو کچھ میری زبان سے نکلا اس کے ایک ایک لفظ پہ اسے یقین تھا۔ چنانچہ اس کے خواب وخیال کو جو دھچکا لگا اور بے انتہا مایوسی ہوئی اس نے مجھے بھی بہت رنجیدہ کر دیا۔ اور میں نے سوچا کہ چلو اس سے سفید جھوٹ بولا جائے (تا کہ اس کے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے) میں نے اس سے کہا۔ دیکھو مجھے ایک اور لڑکی سے محبت ہے جو ہر بات میں ایسی نیلی گاؤن والی لڑکی سے ملتی جلتی ہے۔ مگر اس جھوٹ سے کام چلا نہیں۔ وہ اس پر بھی متذبذب ہی رہا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی بھوری آنکھوں سے آنسوؤں کی دو لڑیاں جاری ہو گئیں اور ہاتھ پاؤں یوں کے یوں ہی رہ گئے۔

زینے کے نیچے والے گھنٹے نے ٹن ٹن رات کے دس بجائے۔

"اب سونے کا وقت ہو گیا۔ کل تک کے لئے بات چیت ملتوی کر دیں ہم لوگ۔" میرے اچانک دخل دینے سے وہ فوراً چونکا اور اسے محسوس ہوا کہ ہاں غلطی ہوئی۔ زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پہ لاکر اس نے ضرورت سے زیادہ پی جانے کی معذرت کی۔ اور اس بات کی معافی چاہی کہ اس نے بالکل پاگلوں کی سی حرکت کی ہے۔ اور قسم کھائی کہ آئندہ کبھی شراب نہیں پیوں گا۔ پھر مجھ سے پوچھنے لگا کہ کل رات کے کھانے میں کیا آپ تازہ مچھلی پسند کریں گے؟ میں نے اس کا کچھ جواب نہیں دیا۔ گلگٹ کے طشت میں سیب کے باسی چھلکوں پر اس کی نظر پڑی۔ اس نے آہستہ آہستہ

وہ سب سمیٹے اور شب بخیر کہہ کر رخصت ہو گیا۔ مچھلی کی طرح وہ دبے پاؤں وہاں سے چل دیا۔ اور آہستہ سے دروازہ بھیڑتا گیا۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد بھاری بھاری قدموں سے نیچے اُترنے کی آہٹ میں سنتا رہا۔

رات کے بارہ بج گئے۔..... میں اب بھی جاگ رہا تھا اور اپنی میز پر بیٹھا ہوا انسانی معاملات کے نازک رشتوں پر غور کرتا رہا اور ان گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا۔ میرے دماغ میں ایک بے چینی تھی۔ ایک صدا ہوئی جس نے مجھے خیالات کی غفلت سے چونکا دیا۔ شروع میں تو آواز دور سے سنائی دی لیکن بعد میں ایسا محسوس ہوا کہ آواز سیڑھیوں سے آرہی ہے اور آہستہ آہستہ میرے دروازے کی جانب بڑھتی جا رہی ہے۔ وہی سابق فوجی ہو گا شاید مجھ سے کہنے آرہا ہو گا کہ اب رات زیادہ ہو گئی ہے سو جائیے۔ جلدی سے میں نے لیمپ کی بتی گھما دی۔ اور مجھے باہر اندھیرے میں آہستہ سے آہ بھرنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے گھپ اندھیرے کی خاموشی کو توڑنے کے لئے آواز نکالی "کہو!" "میں ابھی اپنے کام سے فارغ ہوا ہوں، اور اب سونے والا ہوں، مگر اس کا کوئی جواب نہ سنائی دیا۔ ذرا دیر کے بعد میں پھر اپنے دروازوں کی طرف بڑھا۔ مگر وہ میرے باہر جھانکنے تک زینے سے نیچے اتر کر جا چکا تھا۔

اس مزے دار واقعے کے بعد اس نے شراب پینا ترک کر دیا۔ اور اسمیں کوئی خاص تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اگر میں کبھی اس سے شراب کے بارے میں پوچھتا تو وہ جواب دیتا کہ آج کل دوکانوں پر اصلی اور عمدہ شراب نہیں ملتی۔ صرف الکوہل ملتا ہے اب وہ عورتوں کا بھی کوئی ذکر تذکرہ نہیں کرتا تھا۔ میرے پاس صنفِ نازک کے جو افراد ملنے جلنے آتے تھے اس سے بھی اسے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ میرے کام کاج سے دلچسپی باقی تھی۔ اب وہ مجھے کبھی یہ نصیحت نہ کرتا تھا کہ آئندہ زندگی کے لئے پیسہ بچا کر رکھئے۔ یہ کبھی میرے اوٹ پٹانگ کپڑوں پر یا میلے کچیلے بے جوڑ لباس

پر نکتہ چینی کرتا تھا۔ میرے متعلق اس کی خوش خیالی ایسی ڈھلی تھی کہ اب
خوش خیالی کے ان چیتھڑوں میں پھر سے پیوند لگانا اور جوڑنا ممکن نہیں تھا
وہ مجھ سے بھی زیادہ تنہائی کی اداسی کا بُری طرح شکار ہوتا چلا جا رہا تھا۔
ایک بار پھر وہ نوجوان لڑکی پیکنگ روانہ ہونے سے پہلے مجھ سے رخصت
ہونے آئی اور پھر رات کے کھانے پر اس کی دعوت میرے یہاں رہی۔ معمول کے
مطابق جو رات کا کھانا ہوا کرتا تھا اس بار اس کھانے میں صرف ترکاری کی ایک
پلیٹ بڑھ گئی تھی۔ باقی سب کچھ وہی تھا۔ میرا سابق فوجی اس دفعہ اتنا اکتایا ہوا
معلوم ہوتا تھا جب وہ کھانے کی پلیٹیں اندر لایا تو اسے دیکھ کر دل ہی دل میں مجھے
بڑا لطف آیا۔ وہ ان واقعات سے ایسا بھرا ہوا تھا کہ ذرا چھیڑ دو تو پھٹ پڑے
اور واقعات ایسے تھے کہ خود اس کی مسرت اور غم پر ان کا گہرا نقش بیٹھ چکا تھا۔ اسکے
بعد سے وہ نوجوان لڑکی کبھی میرے کمرے میں واپس نہ آئی۔ زیادہ عرصہ نہیں
گزرا کہ اس کے متعلق مجھے اتنی خبر ملی کہ وہ اور اس کا شوہر دونوں ٹینٹ سین میں
گرفتار کر لیے گئے۔ مگر یہ خبر میں نے سابق فوجی سے نہیں کہی۔
کچھ عرصہ ہوا جب میں نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ اب کی گرمیوں کی
چھٹی میں ہم دونوں وطن کو ساتھ چلیں گے۔ سات برس ہوئے کہ میں نے اپنے
قصبے کا نیلا آسمان نہیں دیکھا جو آنکھوں میں اتنا بسا ہوا تھا۔ اور نہ اپنے وطن عزیز
کی پیاری زمین کو قدموں سے چھوا ہے۔ اسے بھی وطن گئے ہوئے کوئی چھ
سال گزر چکے تھے۔ اب جون کا مہینہ ہو چکا تھا اور چھٹیوں میں صرف ۸ا دن
باقی رہ گئے تھے۔ اتنے میں خانہ جنگی چھڑ گئی۔ اس نے ایک روز مجھ سے
کچھ روپیہ مانگا تاکہ نان کنگ جا سکے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ نان کنگ میں
چھٹیاں گزاروں گا۔ ادھر چونکہ وہ کھرا اور چپ چاپ رہنے لگا تھا اس لیے

اسے خوش رکھنا بہت مشکل ہوتا جارہا تھا۔ وہ اپنا کھانا پکانے کا کام روز مرّہ انجام دے دیا کرتا تھا اور گھر کے دوسرے معمولی معمولی کام کرتا تھا۔ کبھی کبھی مکان مالکہ کی نوکرانی سے اس بات پر جھگڑ لیتا تھا کہ وہ بغیر پوچھے کوئی چیز کیوں مانگ کر لے جاتی ہے۔ میں سوچا کہ اس کا نان کنگ میں چھٹیاں گزارنا اچھا رہے گا۔ اس کی ضرورت بھی تھی۔ وہ پھر رخصت ہوگیا مگر ایسا گیا کہ پھر نہ آیا۔ میرے خیال میں وہ خانہ جنگی میں شریک نہیں ہوا۔ وہ ہلاک بھی نہیں ہوا۔ اب تک مجھے یہ خیال کرنا اچھا معلوم ہوتا ہے کہ وہ فوج میں خانساماں کے فرائض انجام دے رہا ہوگا۔ اور کبھی کسی روز جب ٹوٹی پھوٹی خانقاہ یا عبادت گاہ میں اس کا قیام ہوگا تو وہ صبح سویرے اُٹھے گا اور اپنی میزبان کے ساتھ بازار جائے گا تاکہ وہاں سے ضرورت کا سامان خرید لائے۔ چاول دال کی دوکانوں پر بیٹھیگا اپنے کسی دوست سے گپ لگائے گا اور دریا کے کنارے کھڑا ہو جائیگا وہاں پر کشتیوں کو تیرتے ہوئے دیکھتا رہے گا۔ شام کو وہ بندوق کی گولیوں کے بکس پر بیٹھ جائے گا۔ بکس جو درخت کی ٹہنیوں کا بنا ہوا ہوتا ہے اور وہاں بیٹھ کر وہ لیمپ کی دھیمی روشنی میں اپنے کارپورل سے دن بھر کی حساب فہمی کرے گا۔ اور جب وہ ترکاریوں کی فہرست کے حساب میں اُلجھے گا جو اس نے کسی ردّی کاغذ پر اپنی ٹوٹی پھوٹی تحریر میں درج کیا ہوگا تو وہ جی ہی جی میں بُرا بھلا کہے گا۔ رات کو وہ کسی لکڑی کے بکس پر سو جاتا ہوگا جس پر پیوند لگی ہوئی سوتی گدڑی بچھی ہوگی۔ میرے تصوّر میں وہ اس طرح آتا ہے کہ اس کا وجود امر ہے۔ کم ازکم آئندہ بیس برس تک وہ ایسے ہی زندہ و شاداب رہے گا۔ اس نے مجھے

کبھی خط نہیں لکھا۔ مگر اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ وہ دنیا میں ہے، زندہ ہے اور رواں دواں ہے۔

اس طرح سے یہ لیمپ میری میز پہ آپہنچا۔ کبھی کبھی میں اسے استعمال کر لیتا ہوں۔ کبھی جب میں ان چیزوں کے بارے میں لکھنے بیٹھتا ہوں جن سے میں مایوس رہا ہوں۔ جو مجھے عزیز رہی ہیں اور یا میں کسی گہرے غور و فکر میں گم ہونے لگتا ہوں تو بجلی کا بٹن دبا دیتا ہوں اور کڑوے تیل کے اسی لیمپ کو پھر روشن کر لیتا ہوں۔ ایسے لمحوں میں وہی سابق فوجی میری نظر کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کا سُرخ چہرہ پھٹی پُرانی وردی۔ وہی وجود، جو پرانے خاندان کا ایک چشم و چراغ اور اس کا نام لیوا تھا۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ اس کی چھوٹی چھوٹی بھوری آنکھوں سے خاموش آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی ہے۔

پاگل کی ڈائری

لہسوُن

مصنف کا نام نئے چینی ادب میں وہی درجہ رکھتا ہے جو ہمارے یہاں پریم چند کو حاصل ہے اور دلچسپ بات ہے کہ دونوں نے عمر بھی برابر پائی اور سن وفات بھی ایک ہی ہے۔ ۱۹۳۶ء میں دنیا کے تین بڑے افسانہ نگار اور نئے افسانے کے معمار اُٹھ گئے۔ ایک گورکی، دوسرے لہسوں، تیسرے پریم چند

پریم چند کا نام اس ضمن میں یوں لیا گیا کہ لہسوُں کو سمجھنے کے لئے پریم چند کو جان لینا کافی ہے محض ایک بنیادی فرق کے ساتھ۔ وہ بنیادی فرق دراصل پریم چند اور لہسوُں کی دو شخصیتوں میں نہیں ہے بلکہ ۱۹۳۰ء ۳۶ء کے ہندوستان اور چین میں ہے اور ان دونوں کی سیاسی اور سماجی تحریکوں میں ہے۔

لہسوُں نئے چینی ادب کے امام ہیں۔ ان کا اصلی نام چاؤشوجن تھا

غیر ملکی ادب سے انھوں نے اعلیٰ ترجمے کئے، مضامین لکھے۔ کہانیاں
لکھیں اور ہر میدان میں اپنا مقام پیدا کیا۔ وہ ایک عالم گھرانے میں
پیدا ہوئے تھے لیکن آغازِ شباب میں ہی ان کے گھر پر مصیبت ٹوٹ
پڑی۔ ماں نے شوہر کی وفات کے بعد بڑی مصیبتوں سے بیٹے کو نانکنگ
کے اسکول میں تعلیم کے لئے بھیجا۔ وہاں سے وہ آگے بڑھے اور بی۔ اے
پاس کرنے پر سرکاری وظیفہ ملا۔ یہاں سے وہ ڈاکٹری کی اعلیٰ سند لینے
کے لئے جاپان چلے گئے۔ وہاں انھوں نے جراحی کی تحقیق کی اور مزید تربیت
حاصل کی۔ انھیں واپسی پہ ڈاکٹری کرنی تھی لیکن ایک واقعے نے انکی
آنکھیں کھول دیں اور انھوں نے محسوس کیا کہ چینی قوم کا علاج صرف
ڈاکٹروں کے نشتر و مرہم کا محتاج نہیں ہے بلکہ کچھ اور بھی چاہیئے
نشتر رکھ کر قلم انھوں نے اُٹھالیا۔

سب سے پہلا کام اس سلسلے میں یہ کیا کہ یورپ کے مظلوم اور دبے
ہوئے ملکوں کی مختصر کہانیاں چھانٹ کر ان کا ترجمہ کر ڈالا۔ انھوں نے
پڑھانا شروع کر دیا۔ ۱۹۱۲ء میں جب مانچو خاندان کی حکومت کا تختہ
اُلٹا گیا اور پارلیمنٹ قائم ہوئی تو انھیں وزارتِ تعلیم میں عہدہ ملا۔
اس کے ایک عرصے بعد وہ یونیورسٹیوں میں چینی ادب کے لیکچرر ہو گئے
اصل میں ۱۹۱۸ء سے انھوں نے ادبی سرگرمی کو دن رات دینے شروع
کئے اور ایسی مختصر کہانیاں لکھیں جنھوں نے چین میں نئی ادبی تحریک
کے لئے میدان ہموار کیا۔

۲۵ء تک انھوں نے ۲۶ کہانیاں لکھیں جو خوب مقبول ہوئیں
اس زمانے میں پیکنگ یونیورسٹی کے طالب علموں نے ہڑتال کی اور لوشون نے

نے ان کی حمایت کی۔ انھیں ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔ پیکنگ جو چین کا شہر علم ہے، وہاں سے اس کے بعد زیادہ تر انقلابی خیالات کے پروفیسر چلے آئے۔ لہسوں بھی آ گئے اور اموے یونی ورسٹی میں پروفیسر ہو گئے۔ پھر کینٹن میں آ کر سن یاٹ سن یونی ورسٹی کے ڈین مقرر ہوئے۔

انقلابی ادب کی راہ سے جھاڑ جھنکاڑ ہٹانے میں لہسوں کے ہاتھ سب سے زیادہ زخمی ہوئے ہیں۔ انھوں نے ۲۷ء ۳۲ء تک رجعت پرست ادیبوں کی مختلف ٹولیوں سے نظریاتی جنگ کی ہے۔ پہلے وہ تخلیقی ادب کے حامیوں سے الجھے مگر پھر خود پرولتاری اور انقلابی ادب کے حامی ہو گئے۔ اور ایسے حامی ہوئے کہ پھر انکی تنقیدیں اور ان کی کہانیاں انقلابی ادب کی علم بردار بن گئیں۔ ۳۰ء میں وہ بائیں بازو کے ادیبوں کی جماعت کے ممبر ہو گئے۔ اور ان ترقی پسند پرچوں میں لکھتے رہے جنھیں کومن تانگ حکومت بار بار بند کرتی رہی۔

چین میں ان کے تنقیدی مضامین کی بڑی اہمیت ہے۔ وہ چین کی قدیم اور جدید ادبی روایات کے بڑے ماہر تھے اور یہ مہارت خود ان کی کہانیوں سے بھی نمایاں ہے جنھیں غیر ملکی ادب پسندوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ لہسوں کی طنز کی دھار تیز ہے اور ان کی ٹکنیک بالکل جدید اور اچھوتی ہے جس نے چین کے قدیم سماج کے پردے چاک کر دیئے ہیں۔ سردار کے۔ ایم پانیکر کے بیان کے مطابق گورکی اور سوفٹ سے لہسوں کو بڑی مماثلت ہے۔ خاص طور سے طرز بیان میں۔

وہ اصلاح کے بجائے انقلاب کی تبلیغ کرتے ہیں اور اسی لئے
اُن کا درجہ چین کے انقلابی ادب میں رہنما کا ہے۔

لہسوُن کی ادبی تحریروں نے اور تحریک نے چین کے انقلابی
ادیبوں کی نوجوان نسل کو بے حد متاثر کیا اور ماؤتون، لاؤشیہہ
لیو پائی یو، وائی وائی اور چاؤشولی جیسے ادیب پیدا کئے۔

زیر نظر کہانی "پاگل کی ڈائری" ۱۸ء میں لکھی گئی تھی اور بیحد
مقبول ہوئی تھی۔ یہ ایک کڑی ہے جو انقلابی بحران کے زمانے
کے ادب اور جدید ترین ادب کے درمیان پل تیار کرتی ہے۔ اور
یہی اس کی اہمیت ہے۔

دو بھائی تھے جن کا نام بتانا یہاں کچھ ایسا ضروری نہیں ہے۔ مڈل اسکول میں جب میں پڑھتا تھا تو ان دونوں دوستوں سے میری کافی بے تکلفی تھی۔ مگر جدا ہوئے برسوں گزر گئے۔ اور جتنا زمانہ گزرتا گیا ان کی خیر خبر اتنی ہی دھندھلی ہوتی چلی گئی۔ کچھ روز ہوئے جب مجھے پتہ چلا کہ ان میں سے ایک کی حالت خراب ہے۔ جب میں اپنے وطن لوٹا تو بیماری کے بستر پر ان سے ملنے گیا۔ بڑے بھائی نے میرا خیر مقدم کیا اور کہا کہ چھوٹا بھائی بیمار ہوا تھا۔ اس نے بیمار پرسی کے لئے آنے پر میرا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ آپ فکر نہ کیجیے۔ اب ان کی حالت بہتر ہے اور وہ ایک سرکاری کام کے سلسلے میں باہر گئے ہوئے ہیں۔ اتنا کہہ کر اس نے زور سے قہقہہ لگایا اور بولا کہ "جب بھائی جان بیمار تھے اور دماغی بحران کی حالت تھی اس وقت انھوں نے ایک ڈائری لکھی تھی۔ ڈائری کو دیکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان کی بیماری کیسی خطرناک ہو گئی تھی۔" بڑے بھائی نے مجھے بتایا کہ اگر بھائی جان کے دوست اس ڈائری کو دیکھیں تو شاید انھیں لطف آئے گا۔

میں نے ڈائری لی اور مطالعہ کرنے کے لئے اپنے گھر لے آیا۔ اسے پڑھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ میرا دوست "مظلومیت کے خلجان" میں مبتلا ہو گیا۔ اسے یہ مراق ہو گیا

تھا کہ مجھ پر ظلم کیا جا رہا ہے۔ ڈائری ایسی زبان میں لکھی ہوئی ہے کہ وہ کافی اُلجھی ہوئی ہے۔ اَن مِل بے جوڑ جملے ہیں اور اُوٹ پٹانگ عبارت ہے۔ نہ تو تحریر یا عبارت پر تاریخیں لکھی ہوئی ہیں۔ نہ روشنائی اور تحریر میں یکسانی ہے۔ اس سے میں نے نتیجہ نکالا کہ یہ ڈائری ایک وقت میں یا ایک تسلسل کے ساتھ نہیں لکھی گئی ہے۔ مگر چونکہ ڈائری کے ان مختلف ٹکڑوں کے درمیان ایک اندرونی منطق اور رشتہ سا نظر آتا ہے اس لئے میں ایک نقل کر کے دماغی بیماروں کے ماہرین کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے اس ڈائری میں لوگوں کے نام تو ضرور بدلے ہیں اگرچہ میں جانتا ہوں کہ ان لوگوں کے نام میرے قصبے کے باہر کی دنیا نہیں جانتی تاہم ناموں کی تبدیلی میں نے کر دی۔ اس کے سوا ساری عبارت لفظ بہ لفظ نقل کی ہے اور ناموں کی تبدیلی سے عبارت میں کوئی خلل نہیں پڑا ہے۔ عنوان کے متعلق عرض یہ ہے کہ خود میرے دوست نے یہ عنوان یا نام قرار دیا تھا۔ اس وقت جبکہ وہ صحت یاب ہو چکے تھے، میں نہیں سمجھتا کہ اس عنوان یا نام کو بدلنے کی کوئی ضرورت رہ جاتی ہے۔

۲ر اپریل۔ جمہوریہ کا ساتواں سال

(۱۹۱۸ء)

(۱)

آج شام چاند بہت روشن ہے۔

تیس برس ہو گئے کہ میں نے اس کو دیکھا ہی نہ تھا۔ آج دیکھا اور بہت فرحت محسوس ہوئی۔ تب مجھے خیال آیا کہ یہ جو تیس ۳۰ برس کا لمبا عرصہ گزرا ہے یہ بالکل خواب کی طرح گزر گیا۔ لیکن مجھے چوکنّا رہنا چاہیے —— ورنہ یہ کاؤ کے کتّے نے مجھے ایسے کیوں گھورا؟ کئی بار گھورا ہے۔

اندیشے کی بات ہے ضرور۔

(۲)

آج رات چاند غائب ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی بُری بات ہونے والی ہے۔ آج صبح جب میں باہر گیا تو خوب ہوشیار اور چوکنا تھا۔ بڑے کاؤ کے تیور بدلے ہوئے سے تھے۔ وہ مجھ سے گھبرایا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے وہ مجھ سے کسی بُرے سلوک کا بدلہ لینا چاہتا ہو۔ چھ سات اور آدمی بھی تھے جو میرے بارے میں کانا پھوسی کر رہے تھے۔ میری نظر پڑنے سے وہ فکرمند اور خوفزدہ معلوم ہوتے تھے۔ سڑک پر سارے آدمیوں کی یہی حالت تھی۔ ان میں سے ایک آدمی تو خاص طور سے بہت ہی بپھرا ہوا تھا۔ وہ میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر زور سے ہنس پڑا اور اس نے دانت پھاڑ دیئے۔ اسے دیکھ کر چوٹی سے ایڑی تک میرا رواں رواں لرز گیا۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ ان لوگوں کی ساری تیاریاں پوری ہو چکی ہیں۔

مگر مجھے کیوں خوف ہوتا۔ میں سڑک پر چلتا رہا۔ بچوں کا ایک جمگھٹا تھا وہ بھی میرے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ بڑے کاؤ کے سے تیور ان بچوں کے بھی معلوم ہوتے تھے۔ ان کے چہروں پر بھی تُرشی نظر آتی تھی۔ میں نے جی میں سوچا کہ آخر ان بچوں سے مجھے یا ان کو مجھ سے کیا بیر ہو سکتا ہے جو یہ بھی ایسے ہو گئے۔ زور سے میری چیخ نکلی "بولو۔ مجھے بتاؤ" سنتے ہی بچے سر پر پیر رکھ کر بھاگے۔

پھر میں نے سوچا کہ بڑے کاؤ اور مجھ میں کون سی دشمنی ہے آخر؟ یا سڑک پر چلتے پھرتے لوگوں کا میں نے کیا بگاڑا ہے؟ صرف اتنی ہی بات ہے نا کہ بیس برس ہوئے جب میں ایک دفعہ کوچیو کے بہی کھاتے پر جوتوں سمیت چڑھ گیا تھا اور مسٹر کوچیو کو اس سے پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ بڑے کاؤ کی اگرچہ کوچیو سے جان پہچان

بھی نہیں ہے مگر معلوم ہوتا ہے کہ اس تک بھی یہ خبر پہنچی ہوگی اور وہ اس توہین کا بدلہ لینے پر تُلا ہوا ہے۔ اسی شخص نے سڑک پر چلتے پھرتے لوگوں کو میرے خلاف خوب بھرا ہے۔ مگر یہ بچّے؟ ان سے اس بات کا کیا واسطہ؟ یہ تو اس وقت ماں کے پیٹ سے بھی نہیں نکلے تھے۔ یہ مجھے اس طرح آنکھیں پھاڑ کر کیوں دیکھتے ہیں جیسے خوفزدہ ہو گئے ہوں۔ جیسے مجھ سے بدلہ لینا چاہتے ہوں۔ اس سے مجھے ہول آتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے اور میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔

اب سمجھا میں ــــــ ان بچوں کے والدین نے انھیں ایسا سکھایا پڑھایا ہوگا۔

(۳)

رات کی نیند اُڑ گئی ہے۔ آدمی کو کسی بات کے سمجھنے کے لئے اُسے خوب کُرید کُرید کر دیکھنا بھالنا چاہیئے۔

یہ لوگ، کیا لوگ ہیں، بعضوں کو مجسٹریٹ نے عدالت کے کٹہرے میں ٹانگ دیا۔ بعض کو شریفوں کے طمانچے کھانے پڑے۔ بعض ایسے ہیں کہ انکی بیویوں کو دو پیسے کے آدمی کی گالیاں سُننی پڑیں۔ بعض کے والدین کی زندگی کا بوریا بستر مہاجنوں نے دنیا سے گول کرا دیا۔ یہ لوگ ساری مصیبتیں سہتے رہے مگر جیسے خطرناک اور بپھرے ہوئے وہ کل نظر آ رہے تھے ایسے تو کبھی نظر نہیں آئے تھے۔ نہ انھیں کبھی اتنا غصہ آیا تھا۔

سڑک پر کل جو وہ عورت چلی جا رہی تھی وہ بڑی عجیب و غریب عورت تھی۔ اس نے اپنے بچّے کے طمانچہ رسید کر دیا اور بولی "میں تجھے کچا چبا جاؤں گی تب میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑے گی"۔ مگر جب وہ یہ لفظ کہہ رہی تھی تو میری طرف دیکھتی جا رہی تھی۔ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا اور وہاں سے دوڑ لیا۔ اس پر

وہ ترش چہروں والا ہجوم دانت پھاڑ کر ہنسنے لگا۔ پھر چن لاڈو آگیا اور مجھے کھینچتا ہوا گھر لے آیا۔

وہ مجھے گھر لے گیا تو گھر میں جسے دیکھتا ہوں وہ بالکل اجنبی کا سا برتاؤ کرتا ہے۔ ان کے چہروں کی بھی وہی کیفیت تھی جو اور لوگوں کے چہروں پر برس رہی تھی۔ میں جیسے ہی مطالعے کے کمرے میں داخل ہوا انھوں نے آگے سے دروازے پر قفل ٹھونک دیا جیسے کسی مرغی یا بطخ کو دڑبے میں بند کر دیتے ہیں۔ یہ معاملہ ایسا ہے جس نے مجھے اور بھی زیادہ الجھاوے میں ڈال دیا ہے۔

کچھ دن ہوئے بھیڑیا گاؤں کی رعایا یہ کہنے آئی تھی کہ ان کے ضلع میں قحط پڑ گیا ہے۔ انھوں نے میرے بھائی سے کہا کہ گاؤں والوں نے ایک بڑے بدمعاش کو مار ڈالا اور مارنے کے بعد کئی آدمی اس پر ٹوٹ پڑے۔ انھوں نے اس کا دل اور جگر نکال لیا۔ ان کا قیمہ کیا اور قیمہ خود کھایا تاکہ ہمت آئے۔ اتفاق سے عین گفتگو کے درمیان میں بھی داخل ہو گیا۔ میرے بھائی اور ان کے کسانوں نے مجھے بری نظر سے دیکھا۔ اب میرا خیال ہے کہ انھوں نے مجھے ویسے ہی دیکھا ہے جیسے سڑک کے لوگ دیکھا کرتے ہیں۔

جب میں اس بات پر غور کرتا ہوں تو چوٹی سے ایڑی تک سارا جسم لرز جاتا ہے۔

یہ لوگ اس شخص کے اعضائے رئیسہ کو ہڑپ کر گئے۔ بھلا یہ مجھے چھوڑ دیں گے؟ ذرا سوچو۔ اس عورت نے کیا کہا تھا "تجھے کچا چبا جاؤں"۔ اب ذرا ان لفظوں کو ان ترش چہروں والے ہجوم کے قہقہوں سے ملا کر دیکھو جو منہ پھاڑے ہنس رہے تھے اور پھر یہ گاؤں کی رعایا جو قصہ سنا رہی تھی۔ ان الفاظ میں کوئی بڑی حقیقت چھپی ہوئی ہے۔ ان کے لفظوں میں زہر بھرا ہوا ہے۔ قہقہے نہیں ہیں خنجر ہیں۔ اور جب یہ

لوگ سفید سفید چمکتے ہوئے دانت پھاڑتے ہیں تو صاف نظر آتا ہے کہ یہ آدمی نہیں بلکہ آدم خور دیو ہیں۔

اب میں جو غور کرتا ہوں تو میں کوئی بدمعاش یا بُرا آدمی نہیں ہوں۔ مگر ہاں میں نے کوچیو کے بہی کھاتے کو جوتوں سے کچلا تھا۔ اب کیا کہا جائے۔ کہنا مشکل ہے۔ ان لوگوں کے دماغ میں کچھ اور خیال گھسا ہوا ہے جس کا قیاس کرنا مشکل ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی ہے کہ یہ لوگ کسی بات پہ آپ سے بگڑ جائیں گے تو کہیں گے کہ آپ بڑے بدمعاش ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ جب میرے بڑے بھائی نے مجھے مضمون لکھنا سکھایا تھا۔ اگرچہ لوگ کچھ ایسے برے نہیں تھے مگر میں نے ان پر تنقید یا نکتہ چینی کر دی تو وہ میری نکتہ چینی پہ پسندیدگی کا اظہار کیا کرتے تھے اور اپنی پسند خاص کا نشان ان جملوں پہ لگا دیا کرتے تھے۔ اور اگر میں بُرے سے بُرے آدمی کو معاف کر دیا کرتا تھا تو وہ کہتے تھے "تم دوسرے لوگوں سے کس قدر مختلف اور کتنے عجیب ہو" بھلا مجھے کیا معلوم ان لوگوں کے خیالات کیسے ہیں۔ خاص طور سے جب وہ کسی آدمی کو ہڑپ کرنے اور چبا جانے کی نیت لئے بیٹھے ہوں۔

ایک ایک بات کو سمجھنے سے پہلے اور رائے قائم کرنے سے پہلے خوب کرید کرید کر دیکھ لینا چاہیئے۔ قدیم زمانوں سے لے کر آج تک یہ دستور رہا ہے کہ لوگوں کو خوراک بنایا گیا ہے۔ مجھے ایسا یاد پڑتا ہے مگر ذہن میں پوری طرح واضح نہیں ہے۔ میں نے تاریخ کی کتاب اُلٹی، اس سلسلہ میں تاریخ سے حوالہ حاصل کرنا چاہا مگر کتاب میں تاریخوں کا پتہ ہی نہیں ہے۔ ہر صفحے پہ کیڑے مکوڑوں کی طرح سے یہ اوصاف لکھے ہوئے تھے کہ خیرات، بخشش، راست بازی، اخلاق حسنہ اور پاکیزگی۔ میں کروٹوں پہ کروٹیں لیتا رہا مگر نیند کا دُور دُور گزر نہ تھا۔ آدھی رات

تک کتاب کو میں نے بڑے غور سے الٹا پلٹا تب کہیں جا کے میری نظر پڑی کہ ان الفاظ اور علامات کے درمیان یا بین السطور میں کیا لکھا ہے۔ وہاں صرف دو الفاظ پوشیدہ تھے: "انسان کو ہڑپ کرنا"

کتاب میں لکھے ہوئے تمام الفاظ، عبارت اور وہ رعایا کسان جو بات کہہ گئے ہیں وہ سب کے سب دانت پھاڑ کر اور آنکھیں گڑا کر مجھے ایسے دیکھتے ہیں کہ ان کی نظروں میں عجوبہ پن پایا جاتا ہے۔

میں بھی آخر ایک آدمی ہوں۔ یہ آدم خور مجھے ہضم کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔

(۴)

آج صبح میں بیٹھا ہوا تھا چپ چاپ کہ اتنے میں چن لاؤ دو کے ہاں سے کھانا آ گیا۔ کھانے میں ایک تو ترکاریوں کا سالن تھا۔ دوسرے بھاپ میں پکی ہوئی مچھلی۔ مچھلی کی آنکھیں سفید اور سخت تھیں۔ مچھلی کا دہانہ ایسے ہی کھلا ہوا تھا جیسے اس آدم خور ہجوم کے منہ نظر آتے تھے۔ میں نے ابھی دو چار ہی لقمے لئے ہونگے کہ میں سوچ میں پڑ گیا کہ یہ چیز جو حلق سے پھسلی ہے وہ کوئی مچھلی تھی یا آدمی چنانچہ مجھے اس بھری ہوئی پلیٹ سے متلی ہونے لگی اور میں نے اسے زمین پر پھینک دیا۔

میں نے کہا "اے لاؤ دو! تم جا کے میرے بھائی سے کہہ دو میرا دم گھٹا جا رہا ہے۔ میں ذرا باغ میں ٹہلنا چاہتا ہوں" لاؤ دو نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ سیدھا باہر چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ لوگ میرے ساتھ کیا کرنے والے ہیں۔ لیکن اتنا ضرور سمجھ گیا ہوں کہ وہ اپنا پنجہ ڈھیلا نہیں کریں گے۔ لازمی بات ہے کہ میرے بھائی صاحب اس بوڑھے آدمی کو بلا کر لائے ہوں گے جو میری طرف دبے

پاؤں سے بڑھ رہا تھا۔ وہ اس بات سے ڈرا ہوا تھا کہ کہیں میں اس کی آنکھوں میں چھپی ہوئی وحشت سے آگاہ نہ ہو جاؤں۔ چنانچہ اس نے اپنی آنکھیں زمین پر بچھائی تھیں۔ اس نے کنکھیوں سے مجھے دیکھا۔ بھائی صاحب مجھ سے کہنے لگے "آپ آج اچھے خاصے معلوم ہوتے ہیں۔ حال بہتر ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "جی ہاں" بھائی صاحب نے بتایا۔ "ہم نے ڈاکٹر ہو کو بلایا ہے کہ وہ آج سے آپ کا علاج اپنے ہاتھ میں لیں۔" میں نے جواب دیا۔ "بہت اچھا۔" گیا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ مجھے یہ بھی خبر نہیں کہ یہ بوڑھا آدمی جو آ رہا ہے دراصل بھیس بدلا ہوا جلاد ہے؟ اس نے نبض دیکھنے کے بہانے ہاتھ بڑھایا۔ حالانکہ اسکی نیت مجھے بھانپ لینے کی تھی کہ میں اب ذبح کئے جانے کے قابل موٹا تازہ ہو گیا ہوں یا نہیں۔ اگر میں ذبح کیا گیا تو اسے بھی اپنی شاندار خدمات کے صلے میں میرے گوشت کا ایک ٹکڑا مل جائے گا۔ مگر مجھے بالکل اندیشہ نہیں ہے۔ میں اگرچہ ان لوگوں کی طرح کوئی آدم خور نہیں ہوں تاہم میری ہمت ان آدم خوروں سے کہیں زیادہ بلند ہے۔ میں نے دونوں مکے تان لئے اور تیار ہو گیا کہ دیکھوں اب یہ کیا کرتا ہے۔ بڑے میاں سیدھے ہو گئے۔ آنکھیں بند کر کے چپ چاپ بیٹھ گئے اور دیر تک میری نبض دیکھتے رہے۔ بہت دیر تک وہ بالکل خاموش رہے۔ اس کے بعد بڑے میاں نے اپنی شیطان صفت آنکھیں کھولیں اور بولے۔ "تم اِدھر اُدھر کی باتیں مت سوچا کرو۔ بالکل پُرسکون اور مطمئن رہو۔ چند روز آرام و راحت سے گزارو پھر تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"ہاں۔ تو سوچا مت کرو۔ آرام کئے جاؤ۔ اور صحت بحال کر لو۔" یہ اس لئے کہا جا رہا ہے کہ میں آرام کرتے کرتے جب تر و تازہ اور فربہ ہو جاؤں گا

تو میں ان کے ہڑپ کرنے کے لئے زیادہ اچھی خوراک بن سکوں گا۔ بھلا مجھے اس سے کیا فائدہ۔ میں بالکل "تندرست" کیسے ہو جاؤں گا۔ لوگوں کا یہ ہجوم جو دوسروں کو چبا جانے پر تلا ہوا ہے۔ جو ادھر اُدھر اپنی خوراک سونگھتا پھرتا ہے اور اپنی نیت چھپانا چاہتا ہے اور جس کی ہمت نہیں پڑتی کہ کھلے بندوں کسی کو ذبح کر لے۔ ان لوگوں پہ مجھے ایسی ہنسی آتی ہے کہ میں ہنستے ہنستے مر جاؤں گا مجھ سے ضبط نہ ہو سکا۔ مجھ پہ زوردار قہقہوں کا دورہ پڑا۔ میں بے حد خوش و خرم تھا۔ میں جانتا بوجھتا ہوں کہ میرے قہقہوں میں حوصلہ مندی اور میرے قہقہے زندگی کی صحیح اسپرٹ پیش کرتے ہیں۔ بڑے میاں اور میرے بھائی صاحب دونوں میرے قہقہوں سے سکتے میں رہ گئے۔ میری ہمت اور حوصلہ اور صحیح جذبہ ان پہ حاوی ہو گیا تھا۔

مگر یہ میری حوصلہ مندی ہے جو انھیں اس بات پہ اور بھی زیادہ آمادہ کرے گی کہ وہ مجھے اپنی خوراک بنا لیں تاکہ میری ہمت اور میرا حوصلہ ان لوگوں کا جزو بدن بن سکے۔ بڑے میاں فوراً دروازہ کھول کر باہر نکل گئے۔ مگر ابھی وہ دُور نہیں گئے تھے کہ انھوں نے بہت آہستہ میرے بھائی سے کہا "جلدی ہی کی جائے" میرے بھائی نے اتفاق کرتے ہوئے سر ہلایا۔ اچھا تو بھائی صاحب کی یہ ملی بھگت ہے۔ اگرچہ میری دریافت ایسی ہے کہ پہلے سے اس کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن مجھے کوئی حیرت نہ ہوئی۔ میرا بھائی اور وہ بھی مجھے ہضم کر جانے کی سازش میں شریک!

آدم خور دیو اور وہ میرا بھائی ہو۔

میں ایک آدم خور کا بھائی ہوں۔

اگر مجھے ہضم بھی کر لیا جائے مان لو۔ تو پھر بھی مجھ پہ یہ الزام رہے گا کہ

میں ایک آدم خور شیطان کا بھائی تھا۔

(۵)

میں نے اور غور کیا۔ فرض کرو وہ خرّانٹ جو میرا معالجہ کرنے آیا تھا، کوئی بھیس بدلا ہوا جلاد نہیں بلکہ سچ مچ ایک ڈاکٹر ہی تھا۔ پھر بھی وہ آدم خور تو ضرور ہوگا۔ وہ کتاب جو موجودہ ڈاکٹروں کے پیشرو ڈاکٹر لی شیہہ چن نے "جڑی بوٹیوں پر" لکھا ہے اس میں صاف طور پر درج ہے کہ انسان کا گوشت بھون کر کھایا جا سکتا ہے۔ اب بھی کیا وہ انکار کر سکتا ہے کہ وہ آدم خور نہیں ہے۔

جہاں تک میرے بھائی کا تعلق ہے۔ میں انھیں بے سبب الزام نہیں دیتا۔ جب وہ مجھے پڑھایا کرتے تھے اس زمانے میں انھوں نے ایک بار خود مجھ سے کہا تھا کہ آدمی روٹی کے لئے اپنی اولاد دے سکتا ہے۔ اور ایک بار کسی بدمعاش کا تذکرہ کرتے ہوئے انھوں نے مجھ سے کہا تھا۔ "اچھا ہوا قتل ہو گیا اس کے لئے یہی بہتر تھا۔ اس کا گوشت چبایا جانا چاہیئے اور اس کی کھال کا کمبل بننا چاہیئے تھا۔ وہ اسی قابل تھا۔" میں اس زمانے میں بہت کم عمر تھا۔ اور میرا دل بہت زور سے دھڑکتا رہا۔ اور اس دن جب بھیڑیا گاؤں کے کسانوں نے آکر آدمی کے ذبح ہونے اور قلب و جگر چبائے جانے کا قصہ سُنایا ہے تب بھی انھیں ذرا اضطراب یا تعجب نہ ہوا۔ وہ برابر اثبات میں سر ہلاتے رہے۔ اس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ ان کے خیالات پہلے کی طرح اب بھی بے رحم اور بے دردی کے ہیں۔ بھلا اگر تم اولاد دے سکتے ہو روٹی کے لئے تو پھر کیا رہ جاتا ہے۔ تم ہر چیز دے سکتے ہو۔ تم کسی کو بھی ہضم کر سکتے ہو۔ پہلے یہ ہوا کرتا تھا کہ جو کچھ وہ کہتے جاتے تھے میں چپ چاپ سُن لیا کرتا تھا ان کے کسی لکچر پر، کسی بات پر زیادہ بحث نہیں کرتا تھا۔ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ

اُن دنوں جب وہ مجھے پڑھایا کرتے تھے، انسان کی چربی تبھی سے اُن کے ہونٹوں پر لگی ہوئی تھی اور ان کے دل میں آدمی کو خوراک بنانے کی تمنّا بھری ہوئی تھی۔

(۶)

ہر طرف اندھیرا ہے۔ معلوم نہیں رات ہے یا دن۔ کاؤ کا کتّا پھر بھونکے جا رہا ہے۔

شیر کی غضب ناکی، خرگوش کی انکساری، لومڑی کی مکاری....

(۷)

اب میں ان کے طریق کار کو بھانپ گیا ہوں۔ یہ لوگ سیدھے طریقے سے مجھے ذبح کرنے والے نہیں ہیں۔ ان کی اتنی ہمت ہی نہیں ہے۔ وہ اسکے انجام سے ڈرتے ہیں۔ چنانچہ اب وہ ملی بھگت سے کام لے رہے ہیں۔ انھوں نے ایسی سازش رچائی ہے کہ چاروں طرف سے گھیر کر خود کو قتل کرنے پر آمادہ کر دیا جائے۔ کل جب سڑک پر میں نے لوگوں کے چہرے پڑھے اور انھیں اپنے بھائی صاحب کے برتاؤ سے جوڑ کر دیکھا تو میں قریب قریب ان لوگوں کی سازش کو نوے فی صدی بھانپ گیا۔ جس بات سے یہ سب سے زیادہ خوش ہوں گے یہ ہے کہ میں اپنی کمر کے چاروں طرف کمرٹکی کا رسّہ کس لوں، اُسے کڑی سے لٹکا دوں اور لٹک کر جان دے دوں۔ اس طرح دم گھٹنے سے میرا خاتمہ بھی ہو جائے گا۔ ان لوگوں پر قاتل ہونے کا داغ بھی نہیں لگے گا اور ان کی دلی تمنّا بھی بر آئے گی۔ یہ مسرّت کے شادیانے بجائیں گے۔ اگر یوں نہ ہوا اور میں غم و خوف کے مارے مر گیا تو میں دُبلا ہو چکا ہوں گا۔ تب بھی وہ رضامندی اور پسندیدگی کا اظہار تو کریں گے ہی۔

یہ لوگ مردار گوشت ہی ہضم کر سکتے ہیں۔ اچھی بات ہے۔ دیکھوں گا۔
ایک بار میں نے کسی درندے کا تذکرہ کہیں پڑھا تھا، جس کا نام تھا چیتا۔
اس کی آنکھیں اور پورا چہرہ ایسا خوفناک ہوتا ہے کہ اس کی تاب لانا مشکل ہے
چیتا عموماً مردار گوشت کھاتا ہے اور بڑی سے بڑی ہڈّی کو بھی چبا کر ریزہ ریزہ
کر دیتا ہے اور پھر انھیں نگل جاتا ہے۔ اس کا خیال کرنے سے بھی میری روح
لرزتی ہے۔ چیتے اور بھیڑیئے میں قرابت داری ہے۔ بھیڑیئے سے کتّے کا نسلی
تعلق ہے۔ کل کاؤ کا کتّا مجھے بار بار گھور کر دیکھ رہا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے
دماغ میں بھی وہی خیال گھُسا ہوا ہو۔ وہ بھی اس سازش میں شریک معلوم ہوتا
ہے۔ اپنا حصّہ اسے بھی ملے گا۔ اگرچہ اس خرانٹ ڈاکٹر نے اپنی آنکھیں فرش
پر بچھا رکھی تھیں لیکن میں بھلا اس بات سے کب دھوکا کھا سکتا ہوں۔

سب سے زیادہ قابل رحم حالت میرے بھائی کی ہے۔ بہر حال وہ
بھی انسان ہے۔ اسے خوف کیوں نہیں آتا۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ مجھے ہضم
کرنے کی سازش میں کیوں شریک ہو گیا۔ کیا وہ اس آدم خوری کی عادت
میں اتنا پختہ ہو گیا ہے کہ اب اسے یہ حرکت بُری نہیں معلوم ہوتی۔ یا وہ اپنے
ضمیر کے خلاف عمل کر رہا ہے اور اس جُرم سے آگاہ ہے جو اس کے ہاتھوں
عمل پذیر ہو گا۔

تم سے لے کر ہر ایک آدم خور دیو پر میں لعنت بھیجتا ہوں۔ تم سے
لے کر ہر ایک آدم خور دیو کو میں سرے سے بدل ڈالوں گا۔

(۸)

اب یہ تمام خیالات اُن کے سامنے واضح ہو جانے چاہئیں . . . . . .
ایک دم کوئی نوجوان میرے پاس آیا۔ زیادہ سے زیادہ اس کی عمر بیس برس

کی ہو گی ۔ مجھے اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آیا، مگر وہ مسکرا رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اس نے سر ہلایا۔ اس کی مسکراہٹ میں سچائی اور اصلیت نہیں تھی۔ میں نے اس سے پوچھا " یہ بتاؤ آدم خوری جائز ہے کیا ؟" اس نے جواب دیا مگر وہ جواب دیتے وقت بھی مسکرائے جا رہا تھا " اس سال تو قحط بھی نہیں پڑا بھلا آدم خوری کیوں ہونے لگی ۔" میں فوراً سمجھ گیا کہ ہو نہ ہو یہ آدمی بھی سازش میں شریک ہے وہ بھی آدم خوری پسند کرتا ہے ۔ اب میری ہمت سو گنا بڑھ گئی ۔ میں نے پھر اسی بات پر زور دیا " میں پوچھتا ہوں کیا یہ جائز ہے ؟"

وہ بولا " ایسے سوالات کرنے سے کیا حاصل ۔ آپ جانتے ہیں مذاق کیسے کرنا چاہیئے ۔ موسم آج بہت عمدہ ہے ۔"

" موسم اچھا ہے تو ہوا کرے ۔ چاند روشن ہے تو ہو ۔ مگر میں تم سے کیا پوچھ رہا ہوں ۔ کیا یہ جائز ہے ؟"

وہ میرے سوال کی تکرار سے الجھن میں پڑ گیا اور اس نے ممنا کر کہا ۔

" جی نہیں ۔"

پھر میں نے پوچھا " جائز نہیں ہے تو یہ لوگ آدم خوری کیوں کرتے ہیں ؟"

" یہ صحیح نہیں ہے ۔"

" اچھا تو یہ صحیح خبر نہیں ہے ؟ بتاؤ انھوں نے بھیڑیا گاؤں میں آدم خوری کیوں کی ۔ اور تمام پرانی کتابوں میں یہ بات تازہ خون جیسے روشن حرفوں میں لکھی ہوئی ہے ۔"

یہ سنا تو اس نوجوان کی صورت بدل گئی ۔ اس کا چہرہ فق ہو گیا ۔ اس نے اپنی آنکھیں پھاڑیں اور بولا " ہو سکتا ہے کہ یہ واقعہ صحیح ہو ۔ ایسا ہمیشہ ہوتا رہا ہے ۔"

"ایسا ہو تا رہا ہے۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کیا ایسا ہوتے رہنا جائز ہے؟"

"میں آپ سے اس سوال پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ آپ کو اس کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہیئے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو غلطی کریں گے۔"

میں ایک دم اچھل کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اس کو گھورنے لگا۔ مگر وہ غائب ہو چکا تھا۔ میں سر سے پاؤں تک ٹھنڈے پسینے میں تر ہو گیا۔ وہ میرے بھائی سے بھی بہت چھوٹا تھا لیکن پھر بھی سازش میں اس کی شرکت تھی ضرور۔ ممکن ہے اس کے والدین نے اسے سکھایا پڑھایا ہو۔ مجھے تو خطرہ ہے کہ اس نے بھی اپنے بیٹے کو یہ تعلیم دی ہوگی۔ جبھی تو چھوٹے چھوٹے بچے بھی میری طرف وحشت ناک نظروں سے دیکھتے ہیں۔

(۹)

وہ لوگوں کو ہضم کر جانا چاہتے ہیں۔ حالانکہ انھیں یہ بھی خوف لگا ہوا ہے کہ خود انھیں ہضم نہ کر لیا جائے۔ وہ جستجو اور شک سے بھری ہوئی نظریں اپنے گرد ڈالتے ہیں اور ایک دوسرے کے چہرے کو بڑے غور و تجسس سے دیکھتے ہیں۔

اگر یہ لوگ اپنے اس خیال خام سے نجات پا جائیں تو وہ اپنے کاروبار میں بڑے مزے سے مصروف رہ سکتے ہیں۔ اطمینان کے ساتھ گھوم پھر سکتے ہیں۔ کھا پی سکتے ہیں۔ چین کی نیند سو سکتے ہیں۔ کیسے لطف کی زندگی ہوگی ان لوگوں کو سدھارنا اور ان کی یہ خصلت بدلنا ایسا ہے جیسے دوسری منزل عبور کرنا یا ایک پہاڑی درہ سے اس پار پہنچنے کے لئے گزرنا۔

مگر کیا ہو۔ باپ اور بیٹے۔ بھائی اور بہنیں، شوہر اور بیویاں، دوست اور دشمن، استاد اور شاگرد اور اجنبی اغرض سب کے سب سازش میں

شریک ہیں۔ ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچے جا رہے ہیں۔ انھیں بھی اپنے جال میں پھانستے جا رہے ہیں۔ وہ اپنے سدھار سے تو مر جانا پسند کریں گے۔

میں صبح سویرے باہر نکلا بھائی صاحب سے ملنے۔ وہ بڑے کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑے تھے اور آسمان کو تک رہے تھے۔ میں ان کے پیچھے پیچھے چلا اور ان کے راستے میں آ گیا۔ میں نے بڑی سماجت سے بڑے صبر و سکون کے ساتھ ان سے کہا " بھائی صاحب میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں "

" ہاں کہو " انھوں نے تیزی سے مڑتے ہوئے اور سر کو ہلاتے ہوئے جواب دیا۔

" میں آپ سے صرف چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھے ان کے بیان کرنے میں بڑی مشکل پیش آ رہی ہے۔ بھائی صاحب میں مانتا ہوں کہ ابتدا میں سب کے سب بن مانس آدم خور ہوا کرتے تھے۔ بعد میں آگے چل کر ان کا رجحان بدل گیا۔ ان میں سے کچھ نے آدمی کو کھانا چبانا چھوڑ دیا اپنی اخلاقی حالت سدھارنے کی انتہائی شدید خواہش نے انھیں بن مانس سے آدمی بنا دیا یعنی وہ اچھے خاصے انسان ہو گئے۔ ان میں سے کچھ ایسے تھے جو اپنے ہم جنسوں کو ہضم کرتے رہے۔ وہ جانوروں اور کیڑوں کی طرح سے تھے۔ پھر ترقی کرتے کرتے مچھلی بنے، مرغی بنے، بندر بنے، یہاں تک کہ موجودہ انسان بن گئے۔ کچھ تھے جن میں ترقی کرنے اور بہتر بننے کی تمنا ہی نہ تھی۔ وہ آج تک وہی جانور کے جانور ہیں۔ وہ لوگ جو اس کے بعد بھی آدم خور ہیں کس قدر شرمناک اور قابلِ نفرت ہے ان کا وجود۔ ان وجودوں سے

کہیں زیادہ قابل نفرت ہے جو انسانوں کو خوراک نہیں بناتے ۔ ان دونوں طبقوں میں کتنا فرق ہے ۔ اتنا جتنا کیڑوں مکوڑوں اور بندروں میں نہیں ہے ۔

"یی یا اپنے بیٹے کو بھونے چی چو کو کھلانے کے لئے [1]" یہ بہت پرانی بات ہوئی ۔ لیکن بھلا کون سوچ سکتا تھا کہ زمین و آسمان کے جدا ہونے کے بعد سے یی یا کے بیٹے تک برابر انسان انسان کو خوراک بناتا رہا ہے ۔ اور پھر یی یا کے بیٹے سے لے کر حال کے زمانے میں شوشی لنگ [2] تک آدمی کی خوراک بنتا رہا ہے ۔ اور پھر اس کے بعد اب یہ بھیڑیا گاؤں کا واقعہ سامنے ہے جہاں ایک آدمی کو پکڑ لیا گیا ۔ پچھلے سال جب عام طور سے پھانسیاں دی جارہی تھیں ایک مدقوق آدمی نے روٹی کا ٹکڑا لے کر اس مجرم کے خون میں تر کیا جس کا سر تن سے جدا کیا جا چکا تھا ۔ خون میں تر کرنے کے بعد اس نے روٹی چاٹ لی اسے امید تھی کہ اسی سے میرے دکھ کا علاج ہو جائے گا ۔

اگر سب کے سب لوگ آدم خوری پر تلے ہوئے ہیں تو میرے بھائی آپ انھیں روک نہیں سکتے ۔ مگر میں پوچھتا ہوں آپ خود اس سازش میں کیوں شریک ہوئے ۔ ان جیسے آدم خور دیو تو کہیں بھی نہیں تھم سکتے ۔ وہ مجھے بھی ہضم کر جائیں گے ۔ وہ آپ کو بھی خوراک بنا سکتے ہیں ۔ اور اسی سازش میں ممکن ہے وہ ایک دوسرے کو ہی کھا جائیں ۔ مگر ہاں ایک صورت ہے

---

[1] پرانی ضرب المثل ہے ۔ صدیوں پہلے چین میں ایک خاندان کی حکومت تھی جس کے دو ظالم حکمراں چی اور چو گزرے ہیں ۔ ایران کے ضحاک کی طرح ان کے متعلق بھی آدم خوروں کی داستانیں مشہور ہیں ۔ مترجم

[2] یہ ایک نوجوان تھا جو جاپان سے تعلیم حاصل کرکے لوٹا تھا اور ۱۹۱۱ء کے انقلاب سے ذرا پہلے اس نوجوان کو انقلابی خیالات رکھنے کی وجہ سے گرفتار کرکے پھانسی دیدی گئی ۔

دگران کا رُخ بدل دیا جائے ۔ اگر ان کی اصلاح ہو جائے تو ہر شخص سکون اور شانتی محسوس کرے گا۔ اگرچہ صورتِ حال یہ ہے تاہم میں اور آپ ایک دوسرے سے خلوص و محبت برت سکتے ہیں۔ بھائی صاحب ان لوگوں کو دھتکار دیجئے انھیں ڈانٹ دیجئے ۔ ان سے صاف کہہ دیجئے کہ آپ ان کی سازش میں شریک نہیں ہوں گے ۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سختی کے ساتھ ان لوگوں سے کہہ سکتے ہیں "نہیں" کیونکہ اس روز جب کسان اپنی لگان کم کرانے آپ کے پاس آئے تھے تو آپ نے کہا تھا "نہیں"!

جب میں نے بھائی صاحب سے یہ بات کہی تو وہ پہلے تو سرد مہری کے ساتھ مسکراتے رہے ۔ لیکن ذرا دیر میں ان کے چہرے پر وحشت کے آثار طاری ہونے لگے اور سازش کے پیچھے چھپی ہوئی نیتوں کا نقاب اُٹھ گیا تو ان کا چہرہ قطعی طور سے ترش اور روکھا ہو چکا تھا ۔ لوگوں کا ایک ہجوم سامنے والے دروازے کے باہر کھڑا ہوا تھا ۔ ٹرا کا ڈاور اس کا کتا یہ دونوں اس ہجوم میں موجود تھے ۔ یہ سب لوگ اپنی گردنیں پھیلائے ہوئے آگے کی طرف جھکے تھے ۔ بعض چہروں کو میں پہچان نہ سکا ۔ وہ بظاہر ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے ان پر نقاب پڑا ہوا ہے ۔ ان کے علاوہ ایسے چہرے بھی تھے جو بھنائے ہوئے تھے ۔ ان کے دانت نکلے پڑتے تھے کیونکہ وہ دانتوں سے اپنے ہونٹ کاٹ رہے تھے تاکہ مسکراہٹ کی پردہ پوشی کر سکیں ۔ میں نے ان سب کو سمجھ لیا کہ سازش میں شریک ہیں ۔ یہ سب کے سب آدم خور شیطان تھے مگر اس کے ساتھ میں یہ بھی جانتا تھا کہ ان تمام لوگوں کے خیالات اور احساسات ایک ہی نہیں ہیں بلکہ ان میں فرق ہے ۔ ان میں سے بعضوں کا خیال تھا کہ ہمیشہ سے ایسا ہوتا چلا آیا ہے ۔ آدم خوری میں کوئی بُرائی نہیں ۔ بعض

ایسے تھے جو آدم خوری کو ناجائز اور بُرا سمجھتے تھے مگر خود ہی اس عادت کے شکار تھے۔ وہ اس بات سے ڈرتے تھے کہ کہیں اس بات کا پردہ چاک نہ ہو جائے۔ چنانچہ میں نے جو کچھ ان سے کہا وہ اس پر بہت بگڑے اور مجھ پر آوازے کسنے لگے۔

اس پر میرے بھائی صاحب کو بھی غصہ آیا۔ وہ زور سے چلائے اور لوگوں کو ڈانٹا "چلو۔ بھاگو یہاں سے۔ کسی پاگل آدمی کا اچھا خاصا تماشا بنا رکھا ہے۔"

تب میری سمجھ میں آیا کہ اچھا ان کا ایک طریقہ اور بھی ہے۔ صرف یہی نہیں کہ یہ لوگ اپنا سدھار کرنے پر آمادہ نہیں ہیں بلکہ ساری تیاریاں مکمل کر چکے ہیں۔ انھوں نے مجھ پر "پاگل" کا لیبل لگا دیا ہے۔ اور جب یہ لوگ مجھے خوراک بنائیں گے تو اس کی سزا سے محفوظ رہنا تو الگ بات ہے اُلٹی ان کی تعریف و تحسین کی جائے گی۔ جب ان کسانوں نے کہا تھا کہ ایک بدمعاش کا خاتمہ کر دیا گیا تو اصل میں ان کی حرکت بھی یہی ہو گی ——— اوہو ——— یہ تو بڑا پُرانا دستور ہے۔

پھر چن لاؤ و بڑے غصے سے ہماری طرف آیا۔ اس کی کیا مجال تھی جو میری زبان بند کر دیتا۔ میں نے زور دیکر ان سازش کرنے والوں کو مخاطب کیا "تم لوگوں کو چاہیے کہ اپنی اصلاح کر ڈالو۔ تم کو چاہیے کہ تہہ دل سے اپنی اصلاح کرو۔ تمہیں خوب معلوم ہونا چاہیے کہ دنیا میں آدم خوروں کی کوئی جگہ نہیں رہے گی۔ اگر تم نے سدھار نہ کیا اپنا تو پھر سمجھ لو کہ خود تمہارا ہی لقمہ بنا لیا جائے گا۔ اگر تم بہت سے بچے بھی پیدا کرو اور بڑی بھی نسل چھوڑ دو تو اصلی انسان اس کا بھی صفایا کر ڈالے گا۔ جیسے شکاریوں کے ہاتھ سے بھیڑیوں کا

صفایا ہو جاتا ہے یتمہیں کیڑے مکوڑوں کی طرح ختم کر دیا جائے گا۔

چن لاؤ دو نے ان تمام لوگوں کو وہاں سے دھتکار کر بھگا دیا۔ اسی اثنا میں میرے بھائی صاحب بھی نہ جانے کہاں غائب ہو گئے۔ چن لاؤ دو نے مجھے سمجھایا کہ جاؤ اپنے کمرے میں آرام کرو۔ سارا کمرہ اندھیرے اور گھٹن سے بھرا ہوا تھا۔ کڑیاں اور شہتیر چرچرا رہے تھے۔ تھوڑی دیر تک چرچرانے کے بعد وہ بُری طرح ڈھیر ہو گئے اور مجھ پر ٹوٹ پڑے۔

اوہ، کس قدر بوجھ ہے۔ اس کو سرکایا نہیں جا سکتا۔ اس ملبے کی خواہش ہے کہ میں یہیں دب کر مر جاؤں۔ مگر میں جانتا ہوں کہ ملبہ اتنا بھاری نہیں ہے۔ میں زور لگاؤں تو اسے ایک طرف کر سکتا ہوں۔ میرا جسم پسینے پسینے ہو رہا ہے۔ مگر تم مجھے اس کے باوجود یہ پکارنے سے نہیں روک سکتے: "اپنا سدھار کرو جلدی۔ تہہ دل سے اپنا سدھار کرو۔ خوب سمجھ لو۔ دنیا میں آدم خوروں کے لئے کوئی جگہ نہیں رہ جائے گی"۔

(۱۱)

سورج نہیں چمکتا۔ دروازہ کبھی نہیں کھلتا۔ دن میں دو بار کھانا آ جاتا ہے۔ کھانے کے چمچوں[۱] کو سنبھالتے ہوئے مجھے اپنے بھائی کا خیال آیا اور میں نے سوچا کہ

میری بہن کی موت کا اصل سبب خود یہی شخص تھا۔ اس وقت میری بہن کی عمر پانچ برس ہو گی۔ وہ کیسی پیاری، اور قابل رحم بچی تھی۔ میں اب بھی اسکا چہرہ دیکھ سکتا ہوں۔ ماں نے زور زور سے چلانا دہاڑنا شروع کر دیا۔

---

[۱] چین میں کھانا دو لکڑیوں کو چمچے کی طرح استعمال کر کے کھایا جاتا ہے۔

یہ میرا بھائی ماں کو روک رہا تھا اور سمجھا رہا تھا کہ روؤ مت۔ شاید ماں کے رونے سے اس شخص کا ضمیر بے چین ہوتا ہوگا کیونکہ اسی نے میری بہن کو ہضم کیا تھا۔ اگر اس کے ضمیر نے اسے بے چین کیا تو......

میری بہن کو یہ بھائی نگل گیا۔ کیا خبر ماں کو بھی یہ راز معلوم ہو یا نہیں ماں کو ضرور معلوم ہو گیا ہوگا۔ مگر جب وہ رو رہی تھی اس وقت کسی سے اس نے یہ کہا نہیں۔ شاید اس نے بھی سوچا ہوگا کہ یہ ٹھیک ہی ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں چار پانچ سال کا تھا اس وقت میرے بھائی نے مجھ سے کہا تھا کہ ایک بیٹا اپنے ماں باپ کی بیماری کے عالم میں زیادہ سے زیادہ سعادتمندی اس طرح دکھا سکتا ہے کہ وہ اپنے بدن سے گوشت کاٹ کر، اسے پکا کر والدین کی خوراک کے لئے پیش کردے۔ ماں یہ بات سنتی رہی اور اس نے بھائی سے نہیں کہا کہ غلط بکتے ہو۔ اگر جسم کا ایک حصہ کھانا جائز ہے تو پھر سارے کا سارا جسم بھی ہڑپ کیا جا سکتا ہے۔ مگر اب جو میں اس پر غور کرتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ ماں جس طرح چلا رہی تھی ضرور اس نے دل کے ٹکڑے کئے ہوں گے اب تو اس گریہ وزاری کو سوچ کر بھی دُکھ ہوتا ہے۔ کیسی عجیب بات ہے۔

(۱۲)

اس کا اندازہ کرنا اور سوچنا بھی ناقابل برداشت ہے۔

چار ہزار برس سے آدمی آدمی کو کھائے چلا جا رہا ہے اور آج کہیں جاکر مجھے یہ احساس ہوا ہے کہ میں ان آدم خوروں میں ساری زندگی گھُلا ملا رہا ہوں میری بہن ٹھیک اس وقت مری جب میرا بڑا بھائی گھر کے کام اور انتظام میں لگا ہوا تھا۔ مجھے کیسے یقین ہو کہ اس نے میری بہن کا گوشت ہمارے کھانے میں نہیں ملا دیا ہوگا۔ تاکہ ہم بھی اسے کھانے میں شریک ہوں۔

بہت ممکن ہے کہ میں بغیر علم کے اپنی بہن کو کھا گیا ہوں اور اب یہ میری باری ہو کہ مجھے کھایا جائے۔

کیا غضب ہے۔ چار ہزار برس سے آدم خوروں کی جو نسل چلی آ رہی ہے میں اس کا ایک فرد ہوں۔ اگرچہ میں نے اس بات پر کبھی غور نہیں کیا مگر اب میں خوب سمجھتا ہوں۔ اصلی آدمی کا پتہ چلانا بے حد مشکل ہے۔

(۱۳)

شاید ابھی ایسے بچے باقی ہوں جنھوں نے انسانی گوشت نہ چکھا ہو ان بچوں کو محفوظ رکھو!

اپریل ۱۹۱۸ء

شیاؤ وارہ خی کی شادی

(از چاؤ شولی)

مصنف ۱۹۰۵ء میں شانسی صوبے کے ایک کاشتکار گھرانے میں پیدا ہوا۔ ابھی طالب علم تھا کہ ایک جنگی سردار کی حکم عدولی کرنے اور اس کے خلاف تحریک چلانے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا اور سکول سے نکال دیا گیا۔ اس کے بعد ایک زمانے تک وہ طرح طرح کی زندگی بسر کرتا رہا، کبھی آوارہ گردی، کبھی کوئی چھوٹا موٹا کاروبار، کبھی سکول ماسٹری۔

جب جاپانیوں سے جنگ چھڑی تو وہ جاپانیوں کے محاذ جنگ کے پیچھے چھاپہ مارنے کی انقلابی مہم میں شریک ہو گیا۔ اس نے اخبارات نکالے بعد میں اخبار نویسی اور نشر و اشاعت اس کا پیشہ بن گیا۔ اور صرف لکھنے کے کام میں اس نے اپنا سارا وقت صرف کیا اور چین کے سب سے بڑے کمیونسٹ پبلشر ژن ہوا پریس میں شامل رہا۔ پچھلے دنوں مصنف ایک چینی رسالے شوشو چنگ چانگ کا اڈیٹر تھا۔ یہ رسالہ ادبی اد

تہذیبی موضوعات کے لئے وقف ہے اور اعلیٰ رسائل میں شمار کیا جاتا ہے۔

حال ہی میں چین سے خبر ملی ہے کہ چینی دیہات اور فیکٹریوں میں لوگوں کی زندگی اور سماج کا مطالعہ کرنے اور ان میں تعلیمی اور تہذیبی سرگرمیاں پھیلانے کے لئے وہ دورہ کر رہا ہے۔

مصنف چاؤشولی کو نئے چین کے ادیبوں میں اہم مقام حاصل ہے۔ اسے ۱۹۴۳ء میں شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ جب یہ کہانی "شیاؤارہ خی کی شادی" چھپی ہے۔ اس کے بعد کئی اور کہانیاں اور ناولٹ بھی کافی مقبول ہوئے۔ زندہ افسانہ نگاروں میں اسے 'ٹنگ لنگ'، 'ماؤتون' اور 'لاؤشی' کے بعد اہم ترین مقام حاصل ہے۔

اس کی کہانیوں اور ناولوں میں طرز بیان کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں طنز اور جملہ بازی بہت ہوتی ہے لیکن یہ طنز محض لفاظی نہیں ہے بلکہ ان کرداروں کے تذکرے کا ایک حصہ ہے جو کردار ایک خاص سماجی مسئلے کے الجھاؤ کے لئے چنے جاتے ہیں اور تعمیر کئے جاتے ہیں۔ چاؤشولی کا موضوع سخن زیادہ تر زرعی اصلاحات اور شادی محبت اور عام دیہاتی زندگی کا سدھار ہے۔ وہ ان دونوں کو ایک دوسرے میں تانے بانے کی طرح بنتا ہوا چلتا ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ چینی دیہات کی روایات سے، ان کی کہاوتوں سے، ان کے عادات واطوار سے خوب واقف ہے اور انھیں سمو کر تصویر کو اصلی بنانے میں اپنے ہم عصروں سے کئی قدم آگے بڑھ جاتا ہے۔

چاؤشولی کے بارے میں ایک کمیونسٹ نقاد اور نائب وزیر ثقافت (تہذیبیات) مسٹر چاؤیانگ نے لکھا تھا:۔

"وہ ایک ایسا ادیب ہے جس نے شہرت حاصل کرنے سے پہلے پختگی حاصل کی۔ وہ طبع زاد فنکار ہے۔ اس کا طرز سب سے انوکھا اور بالکل اپنا ہے۔ وہ ایسا ادیب ہے جو عوام کا اپنا ادیب ہے۔"

انقلاب کی فتح کے بعد وہ انتظامی کاموں میں ایسا مصروف رہا کہ ادب لکھنے کی طرف سے غفلت ہوگئی اور پچھلے تین چار سال سے اسکے قلم نے کوئی اہم کہانی یا ناول چینی ادب کو نہیں دیا ہے لیکن یقین کیا جاتا ہے کہ وہ چینی دیہات کی نئی زندگی کے دورے سے فارغ ہوکر پھر اپنے مستقبل کو روشن کرے گا۔ ایسی چیز جو ۱۹۴۹ء کے بعد والے چین کو اور زیادہ وضاحت کے ساتھ اور گہرائی کے ساتھ اُبھارے گی۔

زیر نظر کہانی کا اصل تلفظ "ششیاؤ ارہ خی" ہے لیکن انگریزی ارہ ہی لکھا گیا ہے اور اگر دو ہ ملاکر پڑھی جائیں تو خ کی آواز خود بہ خود پیدا ہوتی ہے۔

(۱)

دو امر آدمیوں کی چڑ

وادی لیؤ میں دو آدمی ایسے تھے جنھیں موت نہیں چھو سکتی تھی۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ واقعی ان میں کچھ اعجاز تھا، کوئی خاص آسمانی کرشمہ تھا یا وہ مجھ سے آپ سے بہتر تھے بلکہ اصل میں وہ خود کو معجز نما کہہ کر پیش کرتے تھے۔ چنانچہ وہ لافانی تھے۔ اور چونکہ جس زمانے کی یہ کہانی ہے اس وقت وہ دونوں ضرورت سے زیادہ زندہ تھے۔ اس لئے ان کا فانی ہونا اس وقت تک ثابت نہیں ہوا تھا۔ انفرادی طور پہ اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ عام لوگوں میں فانی وجود کے بارے میں ایک یقینی بات یہ ہے کہ وہ فانی ہوتے ہیں۔ اسی طرح سے رواداری کی بدولت، توہم پرستی کے ذریعے، فریب نظر اور سادہ دلی، غلط فہمی، خوش اعتقادی یا خوش فہمی، تصنع اور بناوٹ کے ذریعے، حماقت، نادانی، غلط اندازے، بے پروائی، اور لوگوں کی اندھی تقلید کے ذریعے یہ دونوں وجود لافانی اور امر تھے۔

آس پاس کے دیہات میں ہر شخص انھیں جانتا تھا۔ ایک ان میں گُنگ منگ دوم

اگلے گاؤں کا تھا اور دوسری ذات شریف پچھلے گاؤں کی پری زاد سوم۔

کُنگ منگ دوم اس کا اصلی نام نہیں تھا۔ اصلی نام لیوشن تے تھا جس کے معنی ہیں وادی لیو میں نیکیوں کو فروغ دینے والا۔ لیکن اگر نام صرف لیو رہتا تو وہ عام کسان شمار ہوتا۔ دوسرا نام اختیار کرکے اس نے اپنے ساتھ کنفوشس کی پاکیزگی اور برتری کا خوشگوار لٹکا بھی لگا لیا تھا۔ اسے دعویٰ تھا کہ کہانیوں اور کہاوتوں میں جتنی غیر معمولی طاقتیں اس تین سلطنتوں والے عظیم الشان اور زبردست کرشمہ ساز سے وابستہ کی جاتی ہیں جو تقریباً اٹھارہ سو سال پہلے اس وقت دنیا میں موجود تھا جب ہوا کو قابو میں کرنے کا معجزہ ناممکن نہیں تھا۔ وہ تمام غیر معمولی طاقتیں میرے حصے میں آئی ہیں۔

کچھ عرصہ ہوا یہ شخص ایک تجارت پیشہ آدمی تھا لیکن تجارت کا روزمرہ کا کام اس کے لئے اتنا دلچسپ کا سامان مہیا نہ کر سکا جتنا ینگ اور یانگ کی جھاڑ پھونک جنتر منتر کے اندرونی کرشمے، ان کی توڑ موڑ اور پی چینگ علم کی غیب دانی، جیوتش اور پیشین گوئی جس کے متعلق خیال تھا کہ زمین و آسمان کا تمام علم اس میں محفوظ ہے یعنی دوسرے لفظوں میں لافانی اور امر ہستیوں کا سامان تجارت۔ چنانچہ یہ جیوتشی مہاراج ان آسمانی قوتوں سے مشورہ کے بغیر انگلی تک نہیں ہلاتا تھا۔ اور سورج گہن یا چاند گہن کی بھی خوب جانچ پڑتال کر لیتا تھا کیونکہ ان کا بھی بڑا بھیانک اثر زندگی پر ہوتا ہے۔

دوسری ہستی پری زاد سوم کی تھی۔ پچھلے گاؤں کے ایک شخص یو فو سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ وہ واقعی ایک پری تھی اور ہواؤں میں پرواز کرتی تھی۔ ہر ایک قمری مہینے کی پہلی تاریخ اور پندرھویں تاریخ کو وہ اپنا مطمئن اور

پُر وقار چہرہ لال کپڑے میں لپیٹ لیتی تھی اور غیبی پیش گوئیاں کیا کرتی تھی جس سے وہ عورت کے بجائے آسمانی ہستی نظر آنے لگتی تھی۔

بہرحال دونوں امرہستیاں کچھ نہ کچھ تو انسان ضرور تھیں۔ اسی لئے ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک جملہ ناپسند تھا۔ اتنا ناپسند کہ وہ ان کی موجودگی میں زبان پہ لانا منع تھا۔ ان دونوں جملوں کو "امرہستیوں کی چڑ" کہا جا سکتا ہے۔ پہلی شخصیت کنگ منگ ددم کو اس جملے سے نفرت تھی "بیج ڈالنے کے لئے شبھ گھڑی" اور پری زاد سوم اس سے جلتی تھی کہ کوئی کہے "دلیا زیادہ پک گیا۔" بس انھی دو جملوں سے اگر دو نہیں تو ایک کہانی ضرور بنتی ہے۔

ایک سال قحط پڑ گیا وہ بھی ربیع کی فصل میں۔ پانچویں قمری مہینے کی ۳ تاریخ تک بارش کی بوند نہیں پڑی۔ اس روز ایک دم چار انگل بارش ہوگئی۔ دوسرے روز ہر شخص کھیت بونے نکل گیا۔ لیکن حضرت کنگ منگ کو فصل کی بوائی جیسا اہم کام کرانے سے پہلے جنتری کے ورق اُلٹنے پلٹنے تھے۔ جنتری کی مدد لینے کے بعد حضرت کنگ منگ نے اپنے طریقہ پہ جنتر منتر کیا۔ انگلیوں پہ حساب لگایا اور یہ نتیجہ نکالا کہ اس روز فصل بونا نحس ہے۔ یہ بوائی کا شبھ دن نہیں ہے۔ اس کے بعد پانچویں تاریخ آتی تھی جس روز ناگ پنچمی کا تہوار تھا۔ چنانچہ اس روز بھی کام کرنا ممکن نہیں تھا کیونکہ اس مبارک دن کو بوائی کر کے اپنے پچھلے دستور کو توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ چھٹی تاریخ شمسی حساب سے سعد اور سبھ تھی۔ چنانچہ اس دن وہ بیج ڈالنے میں مصروف ہوئے۔ اس وقت تک بارش کا پانی سوکھ گیا۔ چار بیگھے زمین کے ان کھیتوں میں ابھی آدھا ہی اُگا۔ باقی آدھا رہ گیا۔ پندرہ تاریخ کو ایک دم پھر بارش ہوگئی اور لوگ جو وقت پہ بو چکے تھے

ان کا دانا زمین سے پھوٹ رہا تھا اور کنگ منگ اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر زمین کے ان ٹکڑوں پر پھر سے بیج چھڑکتا پھر رہا تھا جہاں کونپلوں کا پتہ نہ تھا۔

ایک نوجوان پڑوسی اتفاق سے رات کو کھانے کے وقت ان بزرگ سے ملا تو اس نے یوں ہی طنز و مزاح کے انداز میں پوچھ لیا "کیوں حضور، کیا آج کا دن بوائی کے لیے بہت شبھ دن ہے؟"

اس کے صلے میں کنگ منگ نے غصّہ بھری نظر ڈالی اور وہ بوڑھا شبدہ باز اپنی دم دبا کر وہاں سے رفوچکر ہو گیا۔ اس کے بعد سے یہ دستور بن گیا کہ جب کبھی لوگ اس سے چھیڑ خانی کرنے پر آمادہ ہوتے تو اس سے پوچھتے "کیا آج بوائی کے لیے شبھ ہے؟" یہاں تک کہ یہ جملہ اس کی چڑ بن گیا۔ اور اس کا ناک میں دم آ گیا۔

اب سُنیئے دوسری طرف کا قصّہ۔ پری زاد سوم کی ایک صاحبزادی تھی اور مجھ سے پوچھئے تو وہ تھی بھی خوبصورت۔ اس کا نام شیاؤچن تھا (آپ اس کا ترجمہ کریں تو کہئے اجوائن بیٹی) نام بڑا شاعرانہ تھا۔ کیونکہ اجوائن محض ایک پھل پھلواری ہی نہیں ہے بلکہ ایک خوشبودار مسالہ بھی ہے۔ ایک دن کیا ہوا کہ چن وانگ کا باپ جو خراب آدمی تھا اپنی بیماری کے متعلق پوچھنے کے لیے پری زاد سوم کے یہاں گیا۔ اب ظاہر ہے کہ چن وانگ کے باپ کو جو بیماری ہوگی وہ کوئی شریفانہ بیماری تو ہوگی نہیں۔ پری زاد سوم اس وقت اپنے مرتبے اور مقام کے مطابق عبادت گاہ میں محراب کے سامنے بڑی خوش الحانی سے بھجن پڑھ رہی تھی اس میں کوئی شک نہیں کہ پری زاد پر جس دیوی کا سایہ تھا وہ خود بہت شور پسند واقع ہوئی تھی۔ چن وانگ کا باپ پہنچا تو اس نے محراب کے سامنے ادب سے دونوں زانو جھکا دیئے اور بڑی عقیدت سے وہ کلماتِ حکمت

سننے لگا جو دیوی کے مقدس لبوں سے ادا ہو رہے تھے۔ اس وقت شیاؤ چن یا یوں کہئے کہ اجوائن کی بیٹی کی عمر ۹ سال تھی۔ اور وہ رات کا کھانا تیار کر رہی تھی۔ کیونکہ آپ جانئے ماں کو اس سے زیادہ ضروری کام کرنے تھے مثلاً یہی کہ دیوی دیوتاؤں سے باتیں کرنی تھیں۔ بیٹی نے ہانڈی میں جو اُبالنے کے لئے ڈالے اور اپنی ماں کے من موہنے بھجن سننے میں ایسی محو ہوئی کہ ہانڈی دیکھنا بھول گئی۔ تھوڑی دیر بعد چن وانگ کا باپ وہاں سے ٹلنے لگا تاکہ ذرا اطمینان کا سانس لے سکے۔ شاید ان مقدس نغموں کی آنچ اس کی برداشت سے باہر ہو گئی تھی۔ اتنے میں پری زاد سوم اپنے تمام آسمانی اوصاف بھول کر بیٹی کی طرف مڑی اور اس نے بالکل گھریلو عورت کے کاروباری انداز میں چلا کر کہا۔ "ہانڈی کو تو اتارو دلیا بہت زیادہ پک گیا۔" اس بھاگوان کو خیال بھی نہیں تھا کہ چن وانگ کا باپ اس جملے کی بھنک پالے گا اور اس کے ذریعے ہر آدمی کو اسکی خبر ہو جائے گی۔ یہی ہوا اور پھر تو وہ گھٹیا اور بے ہودہ لوگ جنھیں فالتو کاموں کے سوا کوئی کام نہ تھا۔ جہاں کہیں پری زاد سوم کو آس پاس دیکھتے، ایک دوسرے سے طنز یہ پوچھنے لگتے "کہو بھئی وہ دلیا زیادہ تو نہیں پک گیا؟" یہ جملہ اتنی بار دہرایا گیا کہ پری زاد کی چڑ بن گیا اور وہ اس سے تنگ آ گئی۔

(۲)

دیوی جنم لیتی ہے

پری زاد سوم کا قصہ یہ ہے کہ پورے تیس برس سے وہ دیوی دیوتاؤں کو پکار رہی تھی۔ ابھی وہ پندرہ برس کی ہوگی کہ یو فو سے اس کی شادی ہو گئی اور تبھی سے یہ سلسلہ شروع ہوا۔ اس زمانے میں اگلے اور پچھلے دونوں گاؤں میں

اس کے حسن کا جواب نہ تھا۔

یوفو بے چارہ بڑا سیدھا سادہ نوجوان ہلوا ہا تھا۔ اسے اپنے کام سے کام تھا۔ لفظوں میں الجھنا اور ان پر وقت ضائع کرنا اسے نہیں آتا تھا۔ زمین کی بوائی جتائی کے سوا اور باتوں سے اسے غرض نہ تھی۔ اس کی ماں مر چکی تھی صرف باپ زندہ تھا۔ باپ بیٹے دونوں گھر سے اُٹھتے اور سیدھے کھیتوں کی طرف چل دیتے۔ خوبصورت دلہن بے چاری تنہا اس گھر میں پاؤں پھیلانے کے لئے رہ جاتی تھی۔ جب ایسی صورت ہو تو ظاہر ہے کہ آس پاس کے جو نوجوان لونڈے تھے انھیں فکر ہوئی کہ بے چاری تنہا پڑی رہتی ہے کچھ وقت اسے بھی دینا چاہیئے اور اس کے جی بہلنے کا سامان ہونا چاہیئے۔ چنانچہ یہ روز کا دستور بن گیا کہ اِدھر وہ دونوں باپ بیٹے گھر سے باہر نکلے اُدھر نوجوان لونڈوں کا ایک جمگھٹا ان کے گھر میں دھومیں مچانے کے لئے داخل ہو گیا۔

حالانکہ یوفو کا باپ بڑا بھولا اور سادہ لوح آدمی تھا لیکن اس کی موٹی عقل میں یہ بات آگئی کہ معاملات جیسے آج کل چل رہے ہیں کچھ ٹھیک نہیں ہیں چنانچہ ایک روز وہ بہت بگھر گیا۔ جہاں تک زبانی جمع خرچ کا تعلق تھا اس نے خوب بے نقط سنائی جس سے اس بات کا ثبوت مل گیا کہ عام موقعوں پر جو ایک سے ایک بڑھ کر گالی اس نے صرف نہیں کی ہے وہ ان کے مصرف سے واقف ضرور ہے اور ان کا محلِ استعمال جانتا ہے۔ گاؤں کے چھوکرے اس کی گالیوں کی تاب نہ لاکر وہاں سے اُڑنچھو ہو گئے۔ مگر بہو بے چاری کو دورہ پڑ گیا۔ وہ خوب چیخی چلائی۔ کراہی۔ ہائے ہائے کرتی رہی۔ روئی دھوئی۔ ۴۸ گھنٹے اس نے دورے کی تکلیف میں گزار دیے۔ کھانا پینا چھوڑ دیا اور اٹوانٹی کھٹوانٹی لے کر پڑ رہی۔ منہ ہاتھ دھونا اور بال بنانا جاتا رہا۔ اس کے تیور چڑھے ہوئے تھے اور

کسی سے بات نہ کرتی تھی۔ یہاں تک کہ بڑے میاں اور صاحب زادے، دولہا میاں کے حواس فاختہ ہو گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کریں کیا۔

بڑے میاں کی ایک پڑوسن تھی بہت بوڑھی جس نے تجویز کیا کہ اچھا فلاں فلاں کو بلواؤ اسے بیچ میں ڈالا جائے تاکہ وہ صحیح مرض کی تشخیص کر سکے چنانچہ وہ دوسری حضرت بلوائی گئیں۔ یہ بھی ایک بوڑھی خرانٹ تھیں۔ جو جھاڑ پھونک اور جن بھوت کا عمل کرتی تھیں۔ وہ آئی اور آتے ہی باپ بیٹے کی خاطر اس تشخیص میں خود معمول بن گئی اور اس نے بتایا کہ بہو پر ایک دیوی سوار ہے اور یہ دیوی پری زاد سوم ہے جو خود اس کی شاگرد ہے۔ یہ سننا تھا کہ بپھری ہوئی بہو کے کان کھڑے ہوئے اور وہ لفظ چبا چبا کر کہنے لگی "ہاں میری دیوی" "نہیں میری دیوی"۔ اس دیوی کے قصے کا طول یا اختصار یہ ہے کہ چاند کی پہلی اور پندرھویں تاریخ کو دلہن وہ دلہن نہیں رہتی تھی بلکہ امر دیوی پری زاد سوم کی زبان یا ترجمان بن جاتی تھی۔ اس سے بڑھ کر یہ ہونے لگا مہینے کی ان دونوں تاریخوں میں اور لوگ اس کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ صندل اور لوبان جلاتے تھے اور اپنی قسمت کا حال، بیماری اور تندرستی کا حال وغیرہ اس سے پوچھا کرتے تھے۔ چنانچہ پری زاد سوم کی درگاہ آباد ہو گئی اور ہوتے ہوتے مرجع خلائق بن گئی۔

یہ معاملہ اتنا سیدھا صاف نہیں تھا ذرا میں اسے دوسرے طریقے سے بیان کروں۔ اس کے بعد نوجوان چھوکرے جب اس پاکیزہ ہستی کی درگاہ میں حاضر ہوتے تو وہ کرشمہ یا معجزہ دیکھنے کی نیت اتنی نہیں ہوتی تھی جتنی اس بات کی تمنا کہ مقدس، پرنور چہرے کے درشن کریں۔ اور پری زاد سوم نہ تو ایسی نادان بچی تھی نہ کوئی بے وقوف تھی جو اتنا بھی نہ سمجھتی ہو کہ یہ لونڈے کس نیت سے

آئے ہیں۔ پری زاد سوم کا لباس روز بروز اجلا اور دلکش ہوتا جا رہا تھا۔ زلفوں کو اس طرح نرم اور دلفریب بنانے میں اُسے کئی کئی گھنٹے لگتے ہوں گے۔ چاندی کے زیور اس کے بدن پر نئے سکوں کی طرح جگمگ جگمگ کرتے تھے۔ اور جس طرح وہ خوب جی کھول کر چہرے کی آرائش کرتی تھی اور پوڈر سرخی لگاتی تھی۔ اسے دیکھ کر تو منہ میں پانی بھر آتا۔ ایسی حالت میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ وہ کسی طرف جائے اور نوجوان اس کے پیچھے پیچھے قدم نہ رکھیں۔

یہ بات کوئی تیس سال پہلے کی ہے۔ ایک زمانہ گذر گیا۔ جب کہ نوجوان عشاق کئی کئی بچوں کے باپ دادا بن چکے ہیں۔ منہ پر لمبی لمبی داڑھیاں اُگی ہوئی ہیں۔ ان میں سے کئی نے انسانی نسل میں اضافہ کر دیا ہے۔ یہ ثابت کرنے کے لئے کہ انھوں نے عمر عزیز یونہی نہیں گزاری ہے۔ چنانچہ گنے چنے دو چار ہی ایسے ضدی اور اڑیل قسم کے کنوارے رہ گئے ہیں جو ابھی تک پری زاد سوم کے پرانے عاشقوں میں جگہ بنائے ہوئے ہیں۔ ورنہ پرانے چاہنے والوں کا کہیں پتہ نہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا وہ اب کسی سے پیچھے رہنے پر رضامند ہو جاتی؟ جی نہیں۔ اگرچہ پری زاد سوم اب ۵۴ کی حد سے گزر چکی ہے تاہم اس کی کشش دور دور پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے ننھے ننھے جوتوں میں کرن گوٹ لگی ہوتی ہے اور پائجامے میں سنجاف کی چوڑی چوڑی گوٹیں لگی ہوتی ہیں۔ چوٹی کی جگہ اگرچہ اب بالوں سے فارغ ہو چکی ہے لیکن اس نے کالے رومال سے اسے خوب ڈھانک لینے کی تدبیر کر لی ہے۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ منہ پر چاہے وہ کتنا ہی پوڈر تھوپ لے مگر جھریاں نہیں چھپتیں۔ اسے دیکھ کر آنکھوں میں کچھ ایسی تصویر آتی ہے جیسے گدھے کی تھوڑی سی لید پر رات کی ہلکی برف رہ گئی ہے۔

ہاں ایک بات ہے۔ کام بنانے میں اس کی مہارت ایسی ہے کہ وہ نہیں تو پھر کچھ نہیں۔ جب اس کے پرانے چاہنے والے اپنے بال بچوں میں پڑ کر اس سے غافل ہو گئے اور وہ الھڑ چھوکروں سے اُکتانے لگی تو اس نے ایسی ترکیب کی اپنے گرد بالکل نوخیز لڑکوں کا جمگھٹ کر لیا۔ جو پہلے والوں سے تعداد میں بھی زیادہ تھا اور صورت شکل میں بھی۔

اب وہ منتر سُنیئے جس نے ان نوجوانوں کو اس کے دروازے پر لا کر چھوڑا یہ منتر تھا اس کی لڑکی شیاؤچن۔

(۳)

شیاؤچن

کچھ بھی ہو لیکن بہر حال پری زاد سوم تھی تو ایک عورت ہی۔ اور عورت کی حیثیت سے اس نے اپنا فرض ــــ کہہ لیجیے کہ شوہر کی خاطر اپنا فرض ادا کیا۔ فرض کی ادائیگی چھ بچوں کی صورت میں ہوئی۔ جن میں سے ایک کو جوان ہونا نصیب ہوا۔ یہ تھی شیاؤچن۔

جب شیاؤچن تین برس کی تھی تو ایک ننھی سی نہایت خوبصورت اور صاف ستھری اور پیاری سی گڑیا تھی۔ ایسی کہ اس سے بہتر کا تصور ممکن نہیں۔ ہر ایک اسے چاہتا تھا۔ اس کی ماں کے جتنے نوجوان احباب تھے سب میں رسہ کشی ہوتی تھی کہ کسی طرح وہی اسے گود میں لیں اور اسے نچائیں کُدائیں۔

ایک کہتا۔ "یہ میری گڑیا ہے"

"نہیں یہ تو میری ہے" دوسرا کہتا۔

تیسرا کہتا۔ "نہیں، میری"

جب وہ پانچ چھ برس کی ہوئی تو اسے محسوس ہوا کہ یہ بات اچھی نہیں ہے۔ اسے سکھا سمجھا دیا کہ جب یہ آنے جانے والے اس قسم کی کھینچ تان کیا کریں یا مذاق کریں تو تم کہہ دیا کرو "میں تو اپنی خالہ کی ہوں" چنانچہ وہ ایسے موقعوں پر یہی الفاظ کہہ دیا کرتی تھی۔ جس کے بعد اس کے لپکنے والے اپنے اپنے دعووں سے دست بردار ہو جایا کرتے تھے۔

اس سال شیاؤچن اٹھارہ برس کی ہوگئی تھی۔ اور جنھیں پچھلا زمانہ یاد ہے وہ کہتے ہیں کہ خود اس کی ماں بھی کبھی اتنی خوبصورت نہیں رہی۔ اب نوجوان اس سے دو تین باتیں کرنے کا موقع نکالنے کے لئے کیسی کیسی ہوشیاری اور فنکاری سے کام لینے لگے تھے بیان قاصر ہے۔ مثلاً وہ گھر کے کپڑے دھونے کے لئے ندی پر جانے لگے تو گاؤں کے سارے نوجوانوں کو کپڑے دھونے کی ضرورت پیش آ جائے گی۔ شیاؤچن کو اگر کھانے یا ترکاری میں ڈالنے کے لئے پتے توڑنے ہیں اور پیڑ پر چڑھنا ہے تو کئی نوجوانوں کو بھی عین اسی وقت پیڑ پر چڑھنا ہے جیسے وہ آدمی نہیں بلکہ بندر ہیں۔

کھانا کھانے کا وقت ہوا تو پاس پڑوس کے کئی نوجوان اپنا اپنا کھانا، برتن اور لکڑی کے چمچے لئے ہوئے پری زاد سوم کے آنگن میں آ پہنچے کہ یہیں کھانا کھالیں گے حد یہ ہے کہ اگلے گاؤں والوں کو بھی ساتھ کھانا کھانے کے معاملے میں بھی یہ میل بھر آنے جانے کا فاصلہ کچھ ایسا فاصلہ نہیں معلوم ہوتا تھا اگرچہ یہ ساتھ کھانا کھانے کا سلسلہ کوئی تیس برس سے جاری تھا مگر اس طرف دو تین سال سے نوجوانوں کی نئی نئی صورتیں متوجہ نظر آنے لگتی تھیں۔

جب وہ نوجوانوں کے جھنڈ پہ ٹولے ہوئے اس کے یہاں آتے تھے۔ اس وقت پری زاد سوم کا بناؤ سنگار دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ بوڑھی

یار باش سمجھتی تھی کہ یہ غول کا غول اس کی توجہ کا محتاج ہے مگر جب انھیں کھنچتے کھنچتے کافی دیر ہوگئی تب کہیں جاکر وہ بھانپ سکی کہ ساری توجہ دراصل اس کی بیٹی شیاؤچن کی طرف ہے۔

مگر شیاؤچن دوسری مٹی سے بنی تھی۔ وہ اپنی ماں کے نقش قدم پر چلنے کو تیار نہ تھی۔ ویسے وہ ان نوجوانوں سے چھیڑ چھاڑ کرلیتی تھی اور ان کے ساتھ دن کا اچھا وقت گزار لیتی تھی لیکن وہ ان میں زیادہ گھلنا ملنا پسند نہ کرتی تھی۔ وہ لئے دیئے رہتی۔ اور اگر ذرا کسی طرف اس کا جھکاؤ تھا تو شیاؤ ارہ ہی کی طرف۔

پچھلے سال سے پہلے کی گرمیوں کا ذکر ہے۔ ایک روز صبح یو فو اپنے کام سے کھیت پر گیا ہوا تھا۔ پری زاد سوم کہیں اور گھومنے پھرنے نکل گئی تھی۔ شیاؤچن گھر پر اکیلی تھی کہ اتنے میں چن وانگ آ پہنچا جو پورے گاؤں کے لئے ایک مصیبت تھا۔ اس کے چہرے پر چکنی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

وہ شیاؤچن کی طرف آنکھوں میں ایک خوفناک تیکھا پن لئے ہوئے بڑھا اور جھٹکا دے کر بولا۔ "لو آج ہمیں موقع ہے۔ آؤ کچھ کر ڈالیں۔"

شیاؤچن نے اسے بڑی سختی سے گھورا۔ "بھائی چن وانگ دیکھو ٹھیک ٹھیک سلیقے کی باتیں کرو۔ اب تمھاری عمر کافی ہے اور تم ہو بھی شادی شدہ۔"

اپنے ہونٹ آگے کو نکالتے ہوئے چن وانگ بولا۔ "اچھا تو آپ معقول اور سلیقہ مند بننے کی کوشش فرما رہی ہیں۔ شیاؤ ارہ ہی اگر آیا ہوتا تو دیکھتے دیکھتے آپ پگھل گئی ہوتیں۔ اگر کچھ حاصل حصول ہونے والا ہے تو سب کو مل بانٹ کر کام چلانا چاہیئے، کوئی بھی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ لیکن اگر تم نے زیادہ معقول بننے کی کوشش کی تو سمجھ لو پھر برا مت کہنا۔" چن وانگ جب بول رہا تھا تو اس نے شیاؤچن کی کلائی پکڑ لی "چلو چلو بس زیادہ مت بنو۔"

اُس نے شوخ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

چن وانگ کو گمان بھی نہیں تھا کہ شیاؤ چن اس طرح زور سے چیخ مارے گی اور یوں پھٹ پڑے گی۔

چن وانگ کا نام لے کر اُس نے جو چیخ ماری تو وہ اُسے جلتی ہوئی اینٹ کی طرح جلدی سے پٹک کر وہاں سے فرار ہو لیا۔ لیکن اپنی پُشت پر کچھ بد دعا کے کلمے چھوڑتا گیا۔

"میں ابھی ٹھیر سکتا ہوں۔ میری جنّو" وہ بھاگتے بھاگتے بولا "میں ابھی پھیروں گا ——— دیکھوں گا۔"

(۴)

شیرے

چن وانگ کا ذکر آیا تو یہاں بتانا ہے کہ پورے لیو کے علاقے میں ایک بھی فرد ایسا نہیں تھا جو اس سے نفرت نہ کرتا ہو۔ صرف ایک اس کا چچا زاد بھائی ژنگ وانگ تھا جس میں خود وہی تمام اوصاف پائے جاتے تھے اور وہ عمر میں چن وانگ سے بھی چھوٹا تھا۔

اگرچہ چن وانگ کا باپ خود بھی ایک کاشتکار ہی تھا۔ اور اسے ایک اچھا آدمی کہلانے کے لئے حلیم، بردبار، صابر و شاکر اور ضبط سے کام لینے والا ہونا چاہیئے تھا لیکن وہ ہمیشہ اپنے برتاؤ میں آباؤ اجداد کے نقشِ قدم پر چلتا تھا اور آبا و اجداد بھی کوئی پُرانے بن مانس یا وحشی قبائل والے نہیں بلکہ وہ جو بالکل جانور ہی تھے۔ ان اجداد میں اور چن وانگ کے باپ میں اگر کوئی فرق تھا تو وہ یہ کہ وہ چارپایہ تھے اور یہ دوپایہ چن وانگ

اس وادی لیو کا ایک درندہ یا شیر تھا۔ جس زمانے میں وہ گاؤں کا مکھیا تھا ان برسوں میں اس کا دلچسپ مشغلہ یہ تھا کہ گاؤں والوں کو پکڑے اور انھیں پیٹا کرے۔

جب اس باپ کا بیٹا سترہ اٹھارہ برس کا ہونے آیا تو وہ بالکل باپ کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ اور جس طرح بطخ پانی میں اُترتی ہے وہ طوفانِ بدتمیزی میں تیرنے لگا۔ چھوٹا چچا زاد بھائی ٹزنگ وانگ بھی اسی کے رنگ ڈھنگ پر آپ ہی آپ اٹھا۔ چناں چہ ان عادتوں کی بدولت اسے بھی ہر شکار میں حصّہ ملنے لگا۔

اس کے بعد سے چن وانگ کے باپ کو خود پہاڑ کھودنے کی ضرورت نہ رہ گئی تھی۔ چن وانگ اور ٹزنگ وانگ دونوں بھائی اکھاڑ و پچھاڑ کر کے اس کا مقصد پورا کر دیا کرتے تھے اور پکی پکائی سامنے رکھ دیتے تھے۔

جاپانیوں کے حملے کے جواب میں جب چین کی جنگ آزادی شروع ہوئی تو ان دنوں ملک میں افراتفری پھیل گئی اور بے نظمی کے حالات عام ہو گئے اس زمانے میں ان لوگوں کو وہ موقع مل گیا جس کے وہ اتنے عرصے سے منتظر تھے۔ جنگ کے ابتدائی زمانے میں غدار، جاسوس، بھگوڑے، دغا باز اور ڈاکو اُٹھائی گیرے سارے دیہات میں اپنی سرگرمیاں دکھانے لگے۔ وہ لوگوں کی کھال میں گھُسے جلتے تھے۔ اور جو شخص ان کے ہتھے چڑھتا اسے ستاتے تھے۔ چن وانگ کے باپ کا اس وقت تک انتقال ہو چکا تھا۔ اب چن وانگ اور اس کے بھائی ٹزنگ وانگ کی ایک اچھی خاصی جوڑی بن گئی۔ وہ فوج سے بھاگے ہوئے سپاہیوں کی ایک ٹولی کے خاص آدمی کا کام کرنے لگے اس طرح کہ انھوں نے لوگوں پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ کبھی تو وہ

دونوں بھائی ان لٹیرے سپاہیوں کے چھاپہ مارنے میں ترکیبیں اور راز بتانے والے کی خدمات انجام دیتے۔ کبھی کسی کو اغوا کرنے میں ہاتھ بٹاتے۔ اور کبھی دوسری طرف سے بے چارے شکار ہونے والے کے ہمدرد حمایتی بن کر ڈنڈ یا بھگتان کی رقم طے کرانے لگتے۔ دیہاتیوں کا بیان ان کے بارے میں یہ تھا کہ یہ لوگ خود جن بھوت تھے اور کئی جن بھوت ان کے قبضے میں تھے۔ کبھی وہ اِس طرف ہو جاتے، کبھی اس طرف۔ اِدھر فائدہ دیکھا تو اس طرف۔ ورنہ اُدھر والوں سے مل گئے۔ اور اس طرح ہر سمت سے وہ گندگی پہ منہ مارتے اور اپنا حلوا مانڈا سیدھا کرتے رہتے تھے۔ جنگ کے پہلے سال یہ ہوا کہ پورا سال بھر انھیں اِدھر اُدھر دیہات میں لوٹ مچاتے اور اپنا الو ٹھٹر کرتے گزر گیا۔ وہ لیو علاقے میں لوٹے ہی نہیں۔ اس وقت ان کی صورت وہاں نظر آئی جب آٹھویں فوج (چینی) نے یہ سارا علاقہ بھگوڑے فوجیوں اور ڈاکوؤں لٹیروں سے صاف کرا لیا۔

پہاڑی لوگ ایک تو فطرۃً بڑے دبیل اور بردبار قسم کے لوگ ہوتے ہیں اور پھر ان پر کئی مہینے اس ہنگامے اور افراتفری کے گزرے تھے جن میں ان کے کئی آدمی اِکّا دُکّی جان سے مارے جا چکے تھے۔ اس کے بعد وہ پہلے سے بھی زیادہ سر اٹھانے میں محتاط اور دبو ہو گئے تھے۔ جب کمیونسٹ وہاں پہنچے تو سارے دیہات میں پنچائتیں قائم کر دی گئیں۔ ان کے دفتر بن گئے۔ "ملک کی حفاظت" والی انجمنیں، جماعتیں، فوجی کمیٹیاں وغیرہ بن گئیں۔ لیکن اس کے بعد بھی وو دئی لیو کے علاقے میں سوائے اس مکھیا یا نمبردار کے جسے ضلع سرکار نے وہاں بھیجا تھا، کوئی مقامی شخص اس بات پر آمادہ نہ تھا کہ کان پو[1] کا عہدہ سنبھال لے تا خو

[1] کان پو۔ کمیونسٹوں کی طرف سے سرکاری انتظامی کمیٹی کا باقاعدہ ممبر ہوتا ہے۔ چینی کمیونسٹ ادب میں اس موقع کے لئے انگریزی لفظ "کیڈر" بھی استعمال ہوتا ہے۔ کان پو کے لفظی معنی "کارکن" اور کارکن کر مچاری یا کاغذی دراصل انتظامی محکمے کے باضابطہ لوگوں کو کہتے ہیں۔ (ظ۔ا)

تھوڑے دن بعد ہی ضلع کی سرکار نے لیو کے دیہات میں کام کرنے والوں کو بھیجا تاکہ وہاں پہنچ کر وہ کان پو (کارکن) کا الکشن کرائیں۔ یہ موقع تھا جسے چن وانگ اور ژنگ وانگ نے بھانپ لیا کہ اس سے فائدہ اٹھا کر طاقت اپنی مٹھی میں لی جاسکتی ہے۔ گاؤں والوں کو بڑی خوشی ہوئی کہ چلو اچھا ہوا۔ کوئی تو اس پر تیار ہوا کہ انتظامی ذمہ داری اپنے سر پر لے۔ چناں چہ انھوں نے ژنگ وانگ کو گاؤں کے ہتھیار بند دستے کا لیڈر چن لیا اور چن وانگ کو شہری انتظامی کمیٹی کا افسرِ اعلیٰ اس کی بیوی کو عورتوں کی اس انجمن کا صدر بنا لیا گیا جو جاپانیوں کے مقابلے کے لئے بنی تھی۔ ان لوگوں نے چند بوڑھے بزرگ آدمیوں کو حجت کر کے اس پر تیار کر دیا کہ وہ دوسرے عہدے سنبھال لیں۔ مگر کسی اڑیل اور ناکارہ آدمی کو وہ "جاپانیوں کے مخالف دستے" کا کپتان نہ بنوا سکے چن وانگ سمجھتا تھا کہ شیاؤ ارہ ہی (یا کلوا) اچھا نوجوان ہے۔ چناں چہ اس نے کلوا کو بلایا اور اُسے بغیر کسی دشواری کے کپتان چنوا دیا۔ شیاؤ ارہ ہی کا باپ یعنی وہی شخص کنگ منگ دوم بیٹے کے اس چناؤ سے کچھ خوش نہ ہوا لیکن اس خیال سے کہ میرا انکار کہیں چن وانگ کو ناگوار نہ گزرے وہ بالکل منہ پر تالا لگائے رہا اور ایک بار اس نے اتنا بھی نہ کیا کہ اپنے جنتر منتر سے ہی کام لیتا۔

گاؤں میں ضلع کی سرکار کا بھیجا ہوا جو نمبردار آیا تھا وہ چوں کہ باہر کا آدمی تھا اسے کچھ خبر نہ تھی کہ اندر کیا معاملہ ہے۔ اس طرح سے چن وانگ اور ژانگ وانگ کو اچھا موقع مل گیا کہ وہ لوگوں پر دھونس جماتے پھریں اور اپنی حکومت جتائیں۔ جب تک ان کی چلتی رہی اور گاؤں کے نئے نمبردار کو انھوں نے اپنی چال بازی سے غافل رکھا اس وقت تک وہ اپنے حکم جاری کرتے رہے اور اپنے اطمینانِ قلب کے لیے لوگوں کو چکر دیتے رہے۔ دوسرا برس ہوا تو کئی افسر

بدلے۔ ان کی جگہ نئے آئے لیکن یہ دونوں اپنی گدی پر پتھر کی سل کی طرح ڈٹے رہے۔ ہر شخص دل میں ان دونوں سے سخت نفرت کرتا تھا مگر کسی کی جرأت نہ ہوتی تھی کہ مخالفت کا ایک حرف زبان سے ادا کرے۔ دیہاتیوں کو خطرہ تھا کہ اگر انھوں نے اپنے من کی چنگاری بھی باہر نکال دی اور انھیں عہدوں کی مسند سے کھینچنا تو الگ رہا اگر ان کے خلاف اپنا جذبہ بھی ظاہر ہوگیا تو وہ اپنے لئے ایک مصیبت کھڑی کرلیں گے۔ چناں چہ اس خطرے کی بدولت یہ ہوا کہ لوگ چپ رہے اور دونوں بے ایمان جھیل کے کنارے کے درخت کی طرح مزے اُڑاتے رہے۔

(۵)

شیاؤ وارہ ہی

شیاؤ وارہ ہی یا وہ نوجوان جسے کلوا کے نام سے پکارتے تھے کنگ ہنگ دوم کا بیٹا تھا۔ ایک بار جاپانیوں کے جوابی حملے میں اس نے ایسی گولی چلائی کہ دشمن کے دو آدمیوں کو موت کی نیند سلایا، اس کے عوض میں شیاؤ کو "نشانہ باز" کا خطاب ملا۔ اس میں صرف لیاقت اور ہمت کے اوصاف ہی نہیں تھے بلکہ ناک نقشہ بھی ایسا عمدہ پایا تھا کہ وادی لیو سے دُور دُور تک خوب صورتی میں اس کا نام تھا۔ نئے سال کے جشن کے موقع پر جب وہ ناٹک منڈلی کے ساتھ آس پاس کے دیہات میں دورہ کرتا تھا تو لڑکیوں کی آنکھیں بلکہ عمر رسیدہ عورتوں تک کی نظریں ہر جگہ اس کا پیچھا کرتی تھیں جیسے وہ اس کی کمر کے پٹکے میں بندھی ہوئی ہوں۔

شیاؤ وارہ ہی کو اسکول کی تعلیم کبھی نہیں ملی۔ گھر پر باپ نے جو کچھ

تعلیم و تربیت دی تھی بس وہی تھی جب وہ چھ برس کا ہوا تو اس نے حرف شناسی شروع کر دی۔ لیکن پرانے ادب میں سے یا اسکول میں جو سرکاری مقررہ کورس کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان میں سے کچھ بھی نہیں پڑھا تھا۔ بچوں کو جو کتابیں عموماً پڑھائی جاتی ہیں مثلاً پانچ ادبی جلدیں، یا کنفیوشس کی چار دینیات یا قومی ادب کی کتاب وغیرہ۔ یہ بھی اس کے باپ کی نگرانی میں اسے پڑھنے کو نہیں دی گئیں بلکہ اس کے ذرا سے بھیجے میں جو چیز ٹھونس ٹھونس کر بھری گئی وہ تھے دس[۱۰] اصول دین۔ بارہ[۱۲] فروعات۔ پانچ عناصر کا تغیر و تبدل اور جنتر منتر کی کتاب "پاکوا"۔ اس کتاب کے چونسٹھ خانوں کے نام سے ابتدا کرنے کے بعد اس کو ایسی موٹی موٹی جادو ٹونے، جنتر منتر اور عملیات کی کتابیں پڑھائی گئی تھیں جیسے "علم غیب کی بے خطا کتاب" "اسرار و رموز" "یی چن مع شرح و تفصیل"۔ "آسمانی کرشمے"۔ "جادو کی چھڑی" "نیک و بد بھاگیہ بتانے کی کنجی" "ینگ یانگ کے خانے" وغیرہ۔

لڑکا ایسا بلا کا ذہین تھا کہ اس نے بہت جلدی سارا حساب جمع تفریق سیکھ لیا اور اس قابل ہو گیا کہ کسی شخص کو فوراً بتا سکتا تھا کہ وہ کس جانور والے سال[۱] میں پیدا ہوا۔ مثلاً یہ کہ وہ ناگ ورش تھا۔ یا واگھ ورش تھا۔ یا بیل، خرگوش، یا بندر وغیرہ۔ جنم پتری نکال کر اس نے اتنا سیکھ تھا کہ وہ پاکوا یعنی علم غیب کی کتاب سے بتا سکتا تھا کہ فلاں فلاں شخص کے مقدر میں کیا لکھا ہے اور کون کون

---

[۱] اصل عبارت میں یہاں سال کا لفظ لکھا ہے۔ میرے خیال میں یہاں مہینہ ہونا چاہیے کیونکہ چین میں بھی علم نجوم کا تقریباً وہی دستور ہے جو ہندوستان یا ایران میں تھا۔ اور بارہ مہینوں کے الگ الگ بارہ برج مقرر ہیں جن میں آفتاب داخل ہوتا ہے مثلاً برج حمل۔ برج حوت۔ برج اسد وغیرہ۔ یہ نام بھی زیادہ تر جانوروں سے تشبیہ دے کر رکھے گئے ہیں۔ (ظ۔ ا)

سال سعد یا نحس ہے۔ بعض اسم اعظم بھی اسے یاد تھے اور وہ منتر جن سے کمال کی باتیں معرض ظہور میں آتی تھیں۔ شیاؤ ارہ ہی کا باپ بھی اس کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنا پسند کرتا تھا۔ اور چونکہ وہ بالکل نئے سکے طرح حسن و زیبائش میں جگمگ کرتا تھا اس لئے ہر شخص اس کے ساتھ کھیلنا اور لطف لینا چاہتا تھا۔ ایک شخص اسے پکارتا "ارہ ہی ادھر آؤ۔ ذرا ہمارا جنم ورش تو بتاؤ" دوسرا ادھر سے آواز دیتا ہے "اچھا میری قسمت کا حال پڑھ کے سناؤ"

مگر جب اس کی عمر ۱۳ برس ہوئی تو ایک تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اسی بدقسمت سال وہ واقعہ پیش آیا جب اس کے نجومی باپ نے بارش کے دوسرے دن کہا "آج کا دن بوائی کے لئے نحس ہے" کنگ منگ کی بیوی آگ انگارہ ہوگئی جب اس نے دیکھا کہ میرے شوہر کی غیب دانی سے سارا کام بگڑ گیا اور اس سال فصل خراب ہوگئی فصل تیار ہونے پر جب اس نے دیکھا کہ ہوشیار پڑوسیوں کے کھیت میں تو فصل خوب بھر کر ہوئی اور اس کے یہاں دانہ بہت کم پڑا تو اسے اور بھی سخت جلن ہوئی۔ کنگ منگ کا بڑا بیٹا تاہ ہی یا "بڑا کلوا" بھی اپنے باپ کی ان حرکتوں سے عاجز آچکا تھا۔ نقصان مایہ تو ہوا ہی شماتت ہمسایہ بھی ہوگئی۔ ایک تو چاول کی پلیٹ کا حصہ کم ہوگیا اور یوں آدھے پیٹ کی بھوک سہنی پڑی، دوسرے یہ کہ پورے خاندان کو جن میں دونوں بھائی بھی شامل تھے سب لوگوں کے قہقہے اور طنز و تمسخر کا نشانہ بننا پڑا۔

شیاؤ ارہ ہی کی عمر اس وقت ۱۳ برس کی تھی۔ اب وہ دو چار باتیں سوچنے لگا تھا مگر بڑے ابھی تک اسے ناسمجھ بچہ ہی شمار کرتے تھے۔ جب یہ سیانے اور بڑی عمر کے لوگ اس کے باپ کے گھر ملنے آئے تو ذرا باپ کو چڑانے کے لئے نو عمر بیٹے سے سوال کرتے "ارہ ہی ذرا ایک کام تو کردو ہمارا۔ بتانا آج کا

دن بوائی کے لئے کیسا رہے گا۔ نحس یا سعد؟" خود شیا ڈارہ ہی کے ہم عمروں کو بھی یہ اچھا خاصا مشغلہ ہاتھ آگیا تھا۔ اور وہ ارہ ہی سے جب کسی بات پہ چڑ جاتے تو اس کا انتقام لینے اور کچھ کے دینے کے لئے زور زور سے چیخ کر پوچھتے "بوائی کے لئے شبھ نہیں" "بوائی کے لئے شبھ نہیں" مہینوں تک ارہ ہی گھر سے باہر نکلنے میں لوگوں کی نظر سے کتراتا رہا۔ اور اس کے بعد سے یہ ہونے لگا کہ وہ ماں کی حمایت کرتا اور باپ کی مخالفت۔ پھر کبھی اس نے علم غیب کی مستند کتاب "پاکوا" کی غیبی باتوں پہ یقین نہ کیا۔

جن دنوں کی یہ کہانی سنا رہے ہیں اُن دنوں ارہ ہی اور شیا ڈچن کی دوستی اور ملاقات کو دو تین سال ہو چکے تھے۔ جب وہ سولہ سترہ کا ہوا تھا تو یہ سردی کی شاموں کا ایک مستقل مشغلہ ہو گیا تھا کہ ارہ ہی بھی پیری زاد سوم کے گھر تفریح کرنے اور گپ لگانے جایا کرتا تھا۔ ورنہ یہ شامیں اداس ہو جاتیں۔ دھیرے دھیرے یہ ہونے لگا کہ اگر شیا ڈچن کی ملاقات ایک ایسی تمنا بن گئی جو اسے بے قرار کرتی رہتی تھی اور جب تک وہ روزانہ شیا ڈچن کے درشن نہ کر لیتا بے قرار رہتا۔ ایسے بھی پڑوسی تھے اس گاؤں میں جو ہمیشہ ان دونوں کی جوڑی بنانے اور شادی کی بات چیت کرنے میں اپنی خدمات پیش کرنے کو کمربستہ رہتے تھے لیکن کنگ منگ اس پہ تیار نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے کچھ اسباب ضرور تھے چاہے دوسرے لوگ اس بات کو سمجھتے ہوں یا نہ سمجھتے ہوں، کنگ منگ کو ان کی پرواہ نہ تھی۔ پہلی دلیل جو وہ ان دونوں کی جوڑی بٹھانے کے خلاف دیتا تھا یہ تھی کہ "شیا ڈارہ ہی نے جس عنصر کے اثر میں جنم لیا تھا وہ تھا دھات اور شیا ڈچن کا جنم آگ کے عنصر کی چھایا میں تھا۔ آگ اگر دھات سے ملے تو پگھل جاتی ہے۔ اس لئے ارہ ہی کی جوڑی آگ والی عورت سے نہ ہونی

چاہیئے ورنہ وہ عمر بھر اس کا فرماں بردار اور زن مرید بن کر رہے گا۔ دلیل نمبر ۲ یہ کہ شیاؤ چن چاند کے دسویں مہینے پیدا ہوئی تھی اور یہ مہینہ عورت کے لئے نحس ہے۔ دلیل نمبر ۳۔ شیاؤ چن کی ماں پری زاد سوم کوئی نیک نام عورت نہیں ہے۔

اس قصے سے نکلنے کا ایک اور سہل راستہ اتفاق کی بات کہ اسی زمانے نکل آیا قسمت کا کرنا کیا ہوا کہ چنگ تہ نو کے علاقے سے قحط کے مارے ہوئے پناہ گزیں آپہنچے۔ ان میں ایک بوڑھا آدمی بھی تھا جس کی آٹھ نو برس کی لڑکی تھی۔ وہ بوڑھا اس بات پر تیار تھا کہ جو شخص اس بچی کو پالنے اور رکھنے پر آمادہ ہو وہ اسی کے حوالے کر دے تاکہ وہ کم از کم بھوک سے نہ مرے اور اس کی جان بچ جائے۔ کنگ منگ دوم اس سستے سودے کے خیال سے بہت خوش ہوا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ اس کی جنم پتری دیکھے بغیر اور تاریخ وقت پیدائش جانے بغیر کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔ چناں چہ ضروری باتیں دریافت کر لینے کے بعد اس نے جادو کی ٹوپی پہن لی۔ نتیجہ جو نکلا وہ بڑے غضب کا تھا۔ اس نے پوتھی سے نکال کر فیصلہ سنا دیا۔

"اگرچہ یہ دونوں ایک دوسرے سے سیکڑوں میل فاصلے پہ پیدا ہوئے لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے بنے ہیں۔ اور ان کا سنجوگ بھاگوان ہے۔"

وہ لڑکی گھر میں رکھنے کے لئے لے لی گئی تاکہ جب وہ کافی بڑی اور سیانی ہو جائے تو شیاؤ ارہ ہی سے اس کی شادی کر دی جائے۔

اگرچہ کنگ منگ دوم کو اپنی غیبی طاقتوں کے اور علم غیب کے ذریعے یہ پتہ چل گیا تھا کہ یہ جوڑی سو فی صدی عمدہ اور مناسب رہے گی۔ لیکن ارہ ہی

کو وہ قائل نہ کر سکا۔ دونوں میں جھگڑا ہو گیا جو کئی دن چلتا رہا۔ جب نجومی باپ اس لڑکی کو لے لینے پر زور دے رہا تھا تو ارہ ہی نے سختی سے جواب دیا "آپ اگر اسے رکھنا چاہتے ہیں شوق سے رکھئے۔ لیکن مجھے نہیں چاہئیے۔ میں اس سے کوئی واسطہ نہیں رکھوں گا۔"

چناں چہ ہوا یہ کہ اگر چہ وہ ننھی سی لڑکی اسی گھر میں رہی لیکن کوئی بات طے نہیں ہو سکی۔ گھر میں اس کی حیثیت کس قسم کی ہے۔ یہ بات بھی گول ہی اور اس دن کا انتظار کیا جانے لگا جب ارہ ہی کو راستے پر لگایا جا سکے۔

(۶)

تہدیدی[1] جلسے

جب سے چن وانگ کو شیاؤ چن نے کاٹا تھا وہ اس تمنا میں گھومتا پھرتا تھا کہ کچھ بھی ہو۔ انتقام لے کے رہوں گا۔ انتقام کی خواہش اسے تیزاب کی طرح کاٹ رہی تھی اور اس کا چہرہ ایسا زرد پڑ گیا تھا کہ دیکھو تو بے اختیار کہو کہ اس کا جگر خراب ہو گیا ہے۔ اسے بے چینی سے انتظار تھا کہ کوئی ایسا موقع ملے جب وہ بدلہ لے سکے۔ اس نے سوچا کہ اب وہ موقع آ گیا جب اسے معلوم ہوا کہ فوجی کونسل کی طرف سے کان یو کی مختصر ٹریننگ جو ہو رہی تھی اس سے شاؤ ارہ ہی ملیریا کا عذر کر کے چل دیا اور ٹریننگ میں آخر تک حصہ نہ لے سکا۔

چن وانگ یہ معلوم کرتے ہی فوراً اپنے بھائی ژنگ وانگ کے پاس

---

[1] تہدید کہتے ہیں کسی کو غلط برتاؤ یا بری بات پر ملامت کرنا۔ ڈانٹنا ڈپٹنا اور تادیب کرنا۔ ان جلسوں کی اہمیت پنچائتی نظام میں یہ ہوتی ہے کہ عدالت پہنچنے سے پہلے فیصلہ ہو جاتا ہے۔

پہنچا اور اسے خبر دی کہ ارہ ہی بیچ میں سے جواب دے رہا ہے۔ اسے شیاؤ چن نے ترغیب دی ہے کہ وہ ٹریننگ چھوڑ کر چل دے اور اپنا سارا وقت اسی کے ساتھ گزار دے۔ اسی لئے اس نے فرض پورا کرنے میں کوتاہی برتی ہے ہم اسے تہذیب کے جلسے میں بلوا کر کھلے عام سخت گرفت کر سکتے ہیں اور سزا دلوا سکتے ہیں۔

ژنگ وانگ نے تجویز سنی تو جیسے اس کے وحشی کانوں میں تیل ٹپک گیا۔ وہ گاؤں کے نیم فوجی ہتھیار بند (ملیشیا) دستے کا لیڈر تھا اور اروہی پر اپنے اختیار اور اقتدار کی دھار آزما سکتا تھا۔ اب بھگتوں گا۔ اس نے سوچا اب کی بار دیکھوں گا۔ اب کی بار حضرت کی دُم میں نمدا کسا جائے گا ژنگ وانگ کو چن وانگ کی حمایت کرنے میں بڑی خوشی تھی کیونکہ شیاؤ چن نے اسے بھی دھتا بتائی تھی۔

پوری طرح دلی اطمینان حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ انتقام جو لیا جائے وہ بھرپور ہو۔ ژنگ وانگ نے بھرپور انتقام کا تصور اور اس کی تدبیر ایسے سوچی کہ وہ اس کے منہ پر برسنے لگی جیسے کسی کے چیچک نکل آتی ہے۔ اس نے چن وانگ کے کہنی ماری، جس کا مطلب تھا کہ اچھی بات ہے سوچ لیا۔ اور باخبر نظروں سے اسے دیکھا۔ اس نے تدبیر یہ رکھی کہ شیاؤ چن کو بھی اس انجمن کی طرف سے کچھ کسا جائے۔ جو انجمن جاپانیوں کے مقابلے میں چینی عورتوں کی جد وجہد کے لئے قائم تھی۔ اس انجمن کی مقامی صدر کوئی غیر نہ تھی خود چن وانگ کی بیوی تھی۔

اگرچہ زوجہ محترمہ کی رائے ہمیشہ اپنے شوہر کی تائید نہیں کرتی تھی۔ لیکن ایک معاملہ تھا کہ جس میں خاتون کی مدد ملتی اور بے مثال ملتی۔ وہ وہ خود بھی کافی دنوں سے شیاؤ چن کو جلن کی آنکھوں سے دیکھتی رہی تھی

اور اس کی نیت صاف نہیں معلوم ہوتی تھی ۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ چن دانگ کے بارے میں اسے خبر ملی تھی کہ وہ وہاں جاتا ہے اگر یہ کانٹا نہ بھی کھٹکتا تو اس کے غصے کا پارہ تو کافی چڑھا ہوا تھا۔ صرف اسی بات پر کہ شیاؤچن میں اور اس کی حریف میں کسی بات کا مقابلہ یا برابری کا سوال نہ تھا۔ زمین آسمان کا فرق تھا۔ چناں چہ چن دانگ جب اپنے گھر پہنچا اور اس نے یہ تجویز سنائی کہ ایک تہدیدی جلسہ رکھا جائے جس میں شیاؤچن کو مزا چکھنا پڑے تو اس کی بیوی جلدی سے سینا پرونا چھوڑ کر اٹھی اور نہایت تیزی کے ساتھ جلدی جلدی تیار ہوئی اور باہر چلی گئی "تاکہ سارا انتظام ٹھیک ٹھاک کر لیا جائے۔

چناں چہ واقعہ یوں ہوا کہ دوسرے دن گاؤں میں دو تہدیدی جلسے ہوئے ۔ ایک جلسہ فوجی کونسل نے شیاؤ ارہی کی تادیب اور ملامت کے لئے بلایا اور دوسرا عورتوں کی جاپان دشمن انجمن کی طرف سے۔ جس میں شیاؤچن کو ہوش میں لانے اور حواس درست کرنے کی کوشش کی گئی۔

گاؤں کے ایک سرے پر دیہاتی جمع تھے ۔ مردوں کے اس ہجوم میں وہ کھوسٹ ناکارہ بوڑھے بھی شامل تھے جن کے اعضا جواب دے چکے تھے اور ہڈیاں چرخ چوں بول رہی تھیں ۔ انھوں نے ہوشیاری سے خود کو اپنی اپنی جگہ سمٹا رکھا تھا اور جھکے جھکائے بیٹھے تھے اس حلقے میں جہاں "کان پو" آلتی پالتی مارے زمین پر براجمان تھے ۔ اسی سڑک پر تھوڑی دور چل کر عورتوں کا مجمع تھا۔ ان میں سے کچھ عورتیں تو بچے اٹھا کر لے کر آئی تھیں کچھ ڈانواڈول اور بدحواس تھیں۔

جب وقت آیا تو شیاؤ ارہی کو نیچا دکھانا اور قبولوانا اتنا آسان نہیں نکلا۔ وہ اپنی پاکبازی پر اس طرح مضبوطی سے قائم تھا کہ اس نے صاف

کہہ دیا کہ میں نے بیماری کا صرف بہانہ نہیں کیا ہے۔ جب ردوقدح میں دیر ہوگئی اور یہ امید جاتی رہی کہ حریف خود اپنے گلے میں طوقِ جرم ڈال دے گا اور اعتراف کرلے گا تو مایوس ہوکر ژنگ وانگ نے حکم دیا کہ اس شخص کو گرفتار کرلیا جائے۔ فیصلہ سُنا دیا گیا کہ اسے باندھ کر اعلیٰ افسروں کے حضور میں پیش کردیا جائے۔ وہ جو چاہیں حکم کردیں۔

اس موقع پر گاؤں کے سردار نے دخل دیا۔ وہ صاف طریقے سے سوچنے والا آدمی تھا اور اسے محسوس ہوگیا کہ یہ کھلی بے ایمانی ہو رہی ہے۔

"سُنو" اس سردار نے ژنگ وانگ کو ذرا سختی سے متوجہ کیا "شیاؤ ارہ ہی کو واقعی ملیریا ہوگیا تھا۔ اس نے جھوٹا بہانہ نہیں بنایا اور جہاں تک اس کے محبت والے معاملے کا تعلق ہے وہ کوئی غیر قانونی بات نہیں ہے اور اسے اس الزام میں گرفتار نہیں جا سکتا۔"

"لیکن جناب الزام یہ ہے کہ اس کی منگنی ایک اور لڑکی سے پہلے ہی ہو چکی ہے۔"

"سب جانتے ہیں کہ وہ چھوٹی سی لڑکی جو اس کی منگیتر سمجھی جاتی ہے اور جس کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ ارہ ہی کی شادی اسی سے ہوگی۔ خود ارہ ہی اسے نہیں مانتا۔" گاؤں کا نمبردار یا سردار بولا۔ "اور یہ صحیح بھی ہے کہ جب تک وہ لڑکی شادی کے قابل بڑی نہ ہو جائے اس وقت تک اس رشتے کو تسلیم نہ کرنا چاہیئے۔ ایک دس برس کی لڑکی جب وہ کل بڑی ہوگی تو ظاہر ہے کہ ارہ ہی کو اس کی آج کی پسند ناپسند پر کچھ نہیں کہے گی شیاؤ ارہ ہی کو پوری آزادی ہے کہ وہ جسے چاہے اپنے دل کی ملکہ بنالے۔ ہم کون ہوتے ہیں دخل دینے والے۔"

اس پر ژنگ وانگ کی سٹی گم ہو گئی۔ اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ چناں چہ موقع کو غنیمت اور مناسب سمجھتے ہوئے ارہ ہی نے اس کا کھودا ہوا کنواں خود اس کے سامنے کر دیا۔ اس نے سختی سے سوال کیا "کیا یہ بات جائز ہے کہ اس آدمی کو گرفتار کیا جائے جس نے کوئی جرم نہ کیا ہو؟"

بڑی مشکل آ گئی۔ گاؤں کے سردار نے سارے جتن کئے تب جا کر وہ ارہ ہی کو ٹھنڈا کر سکا۔ آخر میں اسے راضی کر کے اور منا کر خاموشی سے گھر چلے جانے پر آمادہ کر دیا۔ ژنگ وانگ وہاں اپنے ہونٹ چباتا رہ گیا۔ اس بے چارے نے بڑے جوش و خروش کے ساتھ جو تہدیدی جلسہ بلوایا تھا اور جو تیاریاں کی تھیں وہ سب کی سب خاک میں مل گئیں۔ اس پر وہ پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

وہ ابھی گاؤں کی انتظامی کمیٹی کے دفتر میں ہی بیٹھا تھا کہ اتنے میں شیاؤ چن وہاں آ پہنچی۔ وہ عورتوں کی جاپان دشمن انجمن کی صدر کو تھامے ہوئے وہاں لائی تھی اور گاؤں کے سردار کی تلاش میں آئی تھی۔

ابھی اس دفتر کے دروازے پر مشکل سے قدم رکھا ہو گا کہ وہ زور سے غصے میں چلائی "چوری کا ثبوت جب ہوتا ہے کہ چرایا ہوا مال برآمد ہو۔ اور بد چلنی کا ثبوت جب ہے کہ مرد عورت اس وقت پکڑے لئے جائیں۔ یہ ہماری انجمن کی صدر ہے جو بلا ثبوت کے لوگوں کے سر الزام تھوپتی پھرتی ہے خیر تو سردار صاحب بتلائیے۔ اس سلسلے میں آپ کیا کارروائی کریں گے؟"

جیسے ہی اس نے دیکھا کہ شیاؤ چن نے اس کی بھابی مسز چن وانگ کو جونک کی طرح مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے۔ ژنگ وانگ گھبرایا اور اس کے بدن میں مروڑ پیدا ہوئی کہ اب ساری ملی بھگت کھل جائے گی۔ چناں چہ

اس نے فیصلہ کیا کہ بدقسمتی کے ایسے دن جواں مردی کا تقاضا یہی ہے اور خیریت اسی میں ہے کہ یہاں سے فرار کر جاؤ۔ چنانچہ وہ کھسک گیا۔

جیسے ہی وہ کھسکا، گاؤں کے سردار کی آواز اسے تلقین کرتی ہوئی پیچھے آئی مگر وہ جو انتقام کے جذبے کا ناقابل اصلاح بھوت اس کے سینے میں بے چین تھا اسے پھر بھی تسکین نہ ہوئی۔

(۷)

پری زاد سوم کی ترکیبیں

جب تہدید کے دو جلسے اس طرح ناکام ہو گئے تو شیاؤ ارہ ہی اور شیاؤ چن کی پوزیشن ان کی وجہ سے اور مضبوط ہو گئی۔ اب گاؤں کے سردار نے بھی کھلم کھلا کہہ دیا کہ نئی حکومت اور نئے انتظام میں شادی کی بالکل آزادی ہے۔ اور یہ خوشی کا سودا ہے۔ اب انھیں فرسودہ اور بدبودار رسم و رواج کے پھندوں میں جکڑ کر نہیں رکھا جا سکتا اور نہ کسی کو وہم پرستی اور خیالی عقائد کے زور سے مرضی کے خلاف مجبور کیا جا سکتا ہے۔ جب یہ بات صاف ہو گئی تو دونوں کا حوصلہ بڑھ گیا۔ یہ مان لینے کے بعد کہ اب ان کی آپس کی محبت ایک قانونی اور بالکل معقول بات ہے۔ انھوں نے اس معاملے کو آپس کی گفتگو کا موضوع بنا لیا اور کھلم کھلا بات چیت کرنے لگے تاکہ وہ طریقے سوچے جائیں جن کا انجام بخیر ہو اور سارا کام ٹھیک ہو جائے۔

پری زاد سوم راز پا گئی۔ بات کی تہہ کو پہنچتے ہی وہ گھبرائی اور اس کا پارہ چڑھ گیا۔ اگرچہ شیاؤ چن اس کی بیٹی تھی لیکن کئی سال ہوئے تھے کہ ماں بیٹی نے ایک دوسرے کا سامنا نہیں کیا تھا۔ جس کی وجہ بھی ظاہر تھی۔

پری زاد سوم کی نظران نوجوان لڑکوں پر تھی۔ اور لڑکے شیاؤ چن سے محبت کرتے تھے۔ غالباً ہم یہ تو کہہ چکے ہیں کہ ارد ہی آس پاس کے دیہات والے تمام لڑکوں میں سب سے زیادہ خوب صورت تھا۔ ساری عمر میں کبھی پری زاد سوم نے اپنی مرضی اور اپنے ذوق کا اس سے اچھا نوجوان کبھی نہیں دیکھا۔ ایسا لمبا تڑنگا، متناسب الاعضا، مردانہ وجاہت والا اور ایسا پرکشش۔ وہ ایسا جوان تھا کہ بس بھرا ہوا پکا آلوچہ، جس پر اس کے منہ میں پانی بھر آتا۔ مگر یہ پکا بھرا ہوا آلوچہ اس کی بیٹی شیاؤ چن کے ہاتھ پڑ گیا تھا۔ اس خزاں رسیدہ بڈھی کو اس بھرے ہوئے پکے پھل کا چھلکا بھی کترنے کو نہیں مل سکتا تھا۔

بہت دن سے بڑی بی ان ترکیبوں میں تھی کہ شیاؤ چن کی کسی سے شادی کر کے گھر کی جھک جھک سے باہر کر دے۔ لیکن مشکل یہ آپڑی کہ بڑی بی کا نام ایسا بدنام تھا کہ شاید ہی کوئی نوجوان سے رشتہ پیدا کرنے رضامند ہوتا۔ پھر اتنے میں یہ دو نہد یدی جلسے ہو گئے اور افواہیں پھیلنے لگیں کہ ارد ہی اپنے طور پر شیاؤ چن کے معاملات طے کرنے والا ہے۔ اب اسے یہ بھی فکر نہیں رہی کہ لڑکے اور لڑکی کے والدین کی مرضی حاصل کر لینی چاہیئے۔ یہ سننا تھا کہ پری زاد کے ہونٹ لٹک گئے۔ شیاؤ ارد ہی داماد بنا تو داماد کی حیثیت سے وہ اس کے مقصد سے بہت دور چلا جائے گا اتنا کہ چاند سے بھی زیادہ دور۔ اس رشتے کے ہو جانے کے بعد تو وہ اس سے چھیڑ چھاڑ بھی نہ کر سکے گی۔ ہنسی مذاق کا لطف بھی نہ لے سکے گی۔ کیسے افسوس کی بات ہے۔ یہ سوچتے ہی وہ ایک ایک گھر کا دروازہ کھٹکھٹانے لگی کہ کہیں سے اس کی بیٹی کو بر مل جائے۔ کوئی بھی مرد خدا نکل آئے۔ مگر وہ شیاؤ ارد ہی نہ ہو۔ وہ اسی سے بیٹی بیاہ دے گی۔

ایک پرانی مثل ہے "تم تو بس بھرتی کا جھنڈا لگا دو۔ بھرتی ہونے والے

خود بہ خود آ جائیں گے۔" ایک شخص تھا مسٹر وو نام کا۔ یہ مسٹر وو کسی زمانے میں جنگی سردار ین ژی شان کی فوج میں کرنل کے عہدے پر مامور رہا تھا۔ اب وہ فوج سے ریٹائر ہو چکا تھا۔ وہ ایک ایسا رنڈوا تھا جس کے پاس دولت اور اثر کی کوئی کمی نہ تھی۔ مندر کے میلے میں اس کی نظر شیاؤ چن پر پڑ چکی تھی اور اس کی یہ تمنا تھی کہ اپنی دوسری بیوی ہونے کی عزت شیاؤ چن ہی کو عطا کرے۔ شادی کا جوڑ توڑ کرنے والے بیچ کے بچولئے پری زاد سوم کے پاس پیغام لے کر آئے اور آئے تو پری زاد نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی۔ یہ ایک غیبی امداد تھی جو اسے ملی۔ رسمی خط و کتابت ہوئی اور معاملات طے ہو گئے۔ پری زاد سوم کی امر ہستی جسے اپنی پاکیزہ بہشتی مراد مل گئی تھی اس پر خوشی سے بغلیں بجانے لگی۔

لیکن اگر اس نے سوچا کہ شیاؤ چن بھی اس کی مرضی پر چلے گی اور حکم عدولی نہیں کرے گی تو یہ ضرورت سے زیادہ خوش فہمی تھی۔ شیاؤ چن نے اپنے من میں کچھ اور ہی ٹھان رکھی تھی۔ وہ اس کے لئے بالکل آمادہ نہ تھی کہ ایسے اہم معاملہ میں اپنی بے ہودہ ماں کے کہنے کا خیال رکھے۔

جس روز منگنی پکی ہوئی اور دولہا والوں کے ہاں سے شادی کی مٹھائی وغیرہ آئی اس روز ماں بیٹی میں بڑی لے دے ہوئی۔ شیاؤ چن غصے سے کھول گئی اور اِدھر سے اُدھر پاؤں ٹپکتی پھری۔ ہونے والے دولہا کی طرف سے جو بندے، بالیاں ریشمی کپڑے اور ساٹن کے لباس تحفے میں آئے تھے انھیں اٹھا اٹھا کر یہاں سے وہاں تک زمین پر پٹک دیا۔ اس نے جان بوجھ کر بچولیوں کے سامنے ایسا کیا تاکہ وہ جب یہ تماشا خود دیکھیں تو جا کر امیدوار مسٹر وو سے کہہ دیں۔

جب وہ باہر کے لوگ چلے گئے تو شیاؤ چن نے ماں سے کہا "مجھے اس سے کوئی واسطہ مطلب نہیں ہے، جس نے مسٹر وو کے تحفے لئے ہوں وہ خود اس کے

گھر چلی جائے اور شادی رچالے۔

پری زاد سوم اب تک اس کی درشتی اور بدزبانی کو بہت پی چکی تھی اور خوب سمجھ رہی تھی کہ اس لڑکی سے زیادہ بحث کرنا اور الجھنا فضول ہے۔ لیکن بہر حال پری زاد تھی تو ایک امر عورت، ایک لافانی وجود۔ چنانچہ اس کی جیب میں ابھی ایک ترپ کا پتّہ موجود تھا۔ اس نے بوڑھے الو کی طرح آنکھیں گھمائیں، پلکیں جھپکیں اور بستر پہ آرام کرنے چلی گئی۔ رات کا کھانا اس دن بھی ناغہ نہیں ہوا بلکہ سچ یہ ہے کہ اس رات اگرچہ دلیا اچھی طرح گلا نہ تھا لیکن خوراک سے زیادہ کھایا۔ دلیا اچھی طرح نہ پکنے کی وجہ بھی ظاہر ہے کہ ہونے والے دولہا کی طرف سے بیچ والے لوگ تحفے لے کر آنے والے تھے اور ان کے استقبال کی تیاریوں میں وہ مصروف رہی تھی جس سے اسے دلیا دیکھنے کی فرصت نہ ملی۔

کھانے سے فراغت حاصل کر کے وہ بے تابی سے ٹہلنے لگی۔ اس کی چیخیں، ہائے وائے اور کراہیں بلند ہونے لگیں۔ اس کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو بری طرح بدہضمی اور دردِ شکم کا شکار سمجھا جاتا مگر وہ ایسی عورت تھی کہ اس نے سب پر ایسا ظاہر کیا گویا اور کوئی بات نہیں، یہ دورہ پڑ رہا ہے اور دیوی جی اس پہ آرہی ہیں۔ اگرچہ نہ تو یہ چاند کی پہلی تاریخ تھی نہ پندرھویں تھی۔ مگر اس کے باوجود دیوی نے نہایت آسانی سے تاریخ کا غلط شمار کر لیا تھا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے دو زبردست جماہیاں لیں اور وہ مقدس لحن کے ساتھ بولنے گنگنانے لگی۔ اب اس کی زبان سے کوئی روحانی طاقت بول رہی تھی۔

بے چارہ بھولا آدمی یوفو جلدی جلدی دوڑا اور اس نے لال قندیلیں

روشن کردیں۔ لوبان اور صندل سلگا دیا کہ دیوی کے نازل ہونے کا سامان ہو جائے۔ اس سے فارغ ہو کر وہ درگاہ کے سامنے دوزانو ہو گیا۔ اور آسمانی احکام کے نزول کا انتظار کرنے لگا۔

دیوی نے بڑے لحن اور ترنّم کے ساتھ اور ایسی نغماتی آواز کے ساتھ جو آدمی کے دل میں اُتر جاتی، یوفو کو ڈانٹنا شروع کیا، اسے تہدید کی کہ تم اپنا گھر بار ٹھیک نہیں رکھتے ہو، گھر کے معاملات پر نظر نہیں رکھتے ہو۔ پھر غیبی صدا آئی کہ شیاؤچن اور سٹرود کا سنجوگ لکھا ہوا ہے اور پچھلے جنموں کا کرم ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے ہو کر رہیں۔ شادی کی گانٹھ سورگ (عالم لاہوت) میں لگتی ہے۔ جسے بھگوان نے جوڑا اسے کون توڑ سکے۔

یوفو گھٹنوں کے بل جھکا ہوا چوں کہ ایک بھیڑ کی طرح ناک رگڑ رہا تھا اور ان احکام کے آگے عقیدت کے مارے ایسا بے بس تھا کہ اس کی لگام کسی طرف بھی کھینچی جا سکتی تھی۔ لہٰذا دیوی کا حکم ہوا کہ شیاؤچن کو اس کے کیئے کی سزا دو اور پکڑ کر مار دو۔

شیاؤچن نے یہ جملے سُنے تو اس نے اندازہ کر لیا کہ جو ماں ایسی ہو کہ جب اس کا جی چاہے عورت سے دیوی بن جائے، اس سے بھگتنا بہت مشکل ہے۔ لہٰذا وہ چپ چاپ گھر سے کھسک گئی اور ماں کو اپنے آسمانی بھتنوں میں اُلجھا ہوا چھوڑ کر وہاں سے غائب ہو گئی۔

وہ رات کے اندھیرے میں آہستہ آہستہ دبے پاؤں اگلے گاؤں کی طرف شیاؤ ارہی سے ملنے جا رہی تھی۔ سٹرک پر ارہ ہی مل گیا۔ وہ خود اس کی تلاش میں تھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کے لیے بازو پھیلا دیئے۔ کھُسر پھُسر کرتے ہوئے دونوں ایک کھوہ کی طرف چل دیئے جہاں ان کے خیال میں کسی

ضرر کا اندیشہ نہ تھا۔ وہاں جا کر پری زاد سے نپٹنے کی تدبیر باتفاق رائے سوچی جاسکے گی۔

(۸)

گرفتاری

غار کے اندر اندھیرا گھپ تھا جیسے سیاہ مخمل۔ اس سیاہ مخمل میں لپٹ جانے کے بعد شیاؤچن نے ارہ ہی کو سارا واقعہ سنانا شروع کیا کہ کس طرح اس کی ماں نے ایک بڑھے کیہا ہے۔ پھر اس سے شادی کرانے کے لیئے وہ دیوی بن گئی۔ اور جب دیوی کی زبان سے وہ بول رہی تھی تو اس نے کیا کیا ہدایات جاری کیں۔ اس قصے کو تفصیل سے سنانے میں بڑا وقت ہو گیا۔ اور ارہ ہی بڑے غور سے پورا قصہ سنتا رہا۔

اس واقعے نے ارہ ہی کی ہمت پست نہیں کی۔ وہ بولا "اس عورت کے بارے میں فکر نہ کرو۔ میں نے ضلع سرکار سے خوب پوچھ گچھ کرلی ہے انھوں نے کہہ دیا ہے کہ اگر کوئی عورت مرد آپس میں معاملات طے کرلیں تو وہ جا کر رجسٹر میں اپنا نام لکھوا سکتے ہیں اور ان کی شادی مان لی جائے گی۔ انھیں کوئی روک نہیں سکتا۔"

ابھی وہ اتنا کہنے پایا تھا کہ باہر غار کے دہانے پر کسی کے قدموں کی چاپ سن کر وہ آدھا جملہ کہتے ہوئے رک گیا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور باہر منہ نکال کر دیکھنے لگا۔

چار پانچ آدمیوں کا سایہ پڑ رہا تھا جو آگے بڑھے اور ایک آواز بلند ہوئی "ان دونوں کو عین موقع پر گرفتار کر لو"۔ یہ آمانہ ارہ ہی اور شیاؤچن نے

پہچانی - یہ چن وانگ کی آواز تھی۔

شیاؤ ادہ ہی جواب میں زور سے چلایا "گرفتاری کیوں؟ کسی نے کوئی جرم تھوڑا ہی کیا ہے۔

ژنگ وانگ اس ٹولی سے نکلا اور اس نے حکم دیا "پکڑو پکڑو ان کو۔ جرم کیا ہے یا نہیں - یہ ہم بعد میں دیکھیں گے۔ کئی دن سے تم نے مجھے ناچ نچا رکھا ہے۔"

"جہاں کہو گے میں چلوں گا۔ اگر کہو تو سرحدی سرکار تک چلوں۔ کوئی میں ڈرتا ہوں۔ تم میرا کیا بگاڑ لو گے؟ آؤ چلیں" ادہ ہی نے سرکشی کے انداز میں جواب دیا۔

"یوں چلو گے؟" ژنگ وانگ بولا۔ "ایسے چلنے کا مطلب تو یہ ہوا کہ تمہیں آزاد چھوڑ دیا جائے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ اسے باندھ لو مشکیں کسو۔ لوگو تم اپنا کام کرو۔"

شیاؤ ادہ ہی سے جتنا زور لگایا گیا اس نے مشکیں کسوانے سے انکار کیا۔ بڑی دیر تک دھر پٹخ ہوتی رہی۔ زمین پر کئی بار پٹخنیاں کھائی گئیں کبھی یہ گرا کبھی وہ پکڑ میں آ گیا۔ کتنے ہاتھ پیر ایک دوسرے میں گتھے ہوئے آخر تھا تو وہ تنہا ہی۔ اتنوں کا مقابلہ کب تک کرتا۔ اس مقابلے میں ادہ ہی کے چوٹ بہت آئی اور وہ ادھ موا ہو کر زمین پر رہ گیا۔

اسے مار گرانے کے بعد ژنگ وانگ نے دل میں سوچا کہ اب شیاؤ چن کی باری ہے۔ وہ چلایا "اس غار میں ایک عورت بھی تو ہے۔ اسے بھی پکڑ کر باندھ لو۔ دونوں ساتھ پکڑے گئے ہیں۔ ثبوت بھی ہو گیا۔ یہ خود کہتی تھی کہ دونوں ساتھ پکڑے جائیں تب ثبوت ہوتا ہے۔"

ابھی اس کے جملے ختم نہ ہونے پائے تھے کہ شیاؤ چن کو اس طرح کس کر باندھ لیا گیا جیسے وہ لڑکی نہیں کوئی مرغی ہے جسے بھوننے کے لئے تیار کیا جارہا ہے۔

زیادہ رات نہیں ہوئی تھی۔ اگلے گاؤں کے باشندے ابھی سوئے نہیں تھے۔ پکڑ دھکڑ کا شور سن کر وہ دوڑتے ہوئے اور دیہاتی ساخت کی مشعلیں ہاتھوں میں لئے ہوئے لپکے۔ ایک نظر پڑنی تھی کہ وہ پورا قصہ بغیر پوچھے گچھے سمجھ گئے۔

کنگ منگ دوم بھی اس ہجوم میں شامل تھا۔ اس نے جو دیکھا کہ میرا بیٹا ارہی اس طرح چور بدمعاش کی طرح باندھا گیا ہے۔ وہ ژنگ وانگ کے سامنے دوزانو ہو کر جھکا اور اس نے گڑگڑا کر عرض کیا کہ "ژنگ وانگ ہمارے تمھارے کنبے میں کبھی کوئی عداوت، کوئی بیر نہیں تھا۔ میں بہت بوڑھا آدمی ہوں۔ مجھ پر رحم کھاؤ۔"

ژنگ وانگ نے اس کا جواب دیا "اس معاملے میں اب مجھے کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس میں دخل دینا میرے اختیار سے باہر ہے۔ جو مجرم ہیں وہ بڑے افسروں کے سامنے کھڑے کئے جائیں گے۔"

ارہی نے باپ کو دیکھا تو وہ زور سے چلایا "بابا۔ آپ فکر مت کیجئے کوئی پروا نہیں۔ مجھے کہیں بھی بھیج دیں۔ جب میں نے جرم ہی نہیں کیا تو مجھے سزا کیسے ہو سکتی ہے۔ مجھے کسی بات کا اندیشہ نہیں ہے۔"

ارہی کا یہ جملہ سن کر ژنگ وانگ منہ چڑھا کر بولا "اوہ، تم تو بڑے اچھے ہو۔ دیکھیں گے ہم اگر تمھیں اپنا تھوکا ہوا نہ چاٹنا پڑے۔" عوامی فوج کے رضاکاروں کو جنھیں وہ اپنے ساتھ لایا تھا مخاطب کرتے ہوئے

اس نے کہا "انھیں لے جاؤ۔"

"کہاں لے جائیں" سپاہیوں میں سے ایک نے پوچھا "گاؤں کے دفتر؟"

"کیوں دفتر کیوں؟ تنگ وانگ نے غصّے سے جواب دیا "پچھلی دفعہ تمھیں معلوم نہیں کہ گاؤں کے سردار نے اسے یوں ہی چھوڑ دیا تھا۔ ہم اسے ضلع سرکار کے سامنے بھیجیں گے۔ وہاں فوجی قانون (کورٹ مارشل) کے تحت مقدمہ چلے گا۔"

اور وہاں سے وہ اپنے قیدیوں پر گہری نظریں ڈالتا ہوا لاٹھی کی طرح اکڑ کر روانہ ہو گیا۔

(۹)

جوتشی مہاراج نے فال نکالی

گاؤں والے کچھ ایسے چن وانگ اور تنگ وانگ سے سہمے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھوں بے بسی محسوس کرنے کے ایسے عادی ہو چکے تھے کہ کسی نے ان ہی کی گرفتاری پر چوں نہ کی۔ جن لوگوں نے ہنگامہ برپا کیا تھا جب تک وہ اندھیرے میں نظر سے اوجھل نہ ہو گیا، دیہاتیوں کا ہجوم انھیں ٹیڑھی نظروں سے چپ چاپ دیکھتا رہا۔ اس کے بعد ان لوگوں نے بے چارے کنگ منگ دوم کو گھٹنوں کے بل سے سیدھا کیا اور اسے سہارا دیتے ہوئے گھر لے آئے۔

بڑھے کے گھٹنے اگرچہ اس اشتعال سے بے جان ہو گئے تھے لیکن زبان کیتلی کے اُبلتے ہوئے پانی کی طرح بڑبڑا رہی تھی۔ وہاں سے واپسی پر جب تک وہ اپنے گھر نہیں پہنچ گیا اور جب تک اس کے پڑوسی سننے پر آمادہ رہے

اس وقت تک وہ برابر بولتا رہا اور پورے واقعے کا راز اپنے انداز میں فاش کرتا رہا۔

بولنے میں اس کا ضعیف رعشہ دار سر ہلتا ڈولتا جا رہا تھا اور بیچ بیچ میں وہ سسکیاں لیتا جا رہا تھا اور سب کو باخبر کر رہا تھا "میرے بچے، مجھے پہلے سے معلوم تھا کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ کل پرسوں کی بات ہے میں کھیت میں جا رہا تھا، میں ابھی پہاڑی کے پشتے پر چڑھا ہی تھا کہ میری نظر ایک نوجوان عورت پر پڑی جو گدھے پر سوار چلی جا رہی تھی۔ سر سے پیر تک سفید۔ اور درد و غم میں ڈوبی ہوئی۔ جیسے کسی کا سوگ منا رہی ہو۔ میں اسے دیکھتے ہی سمجھ گیا تھا کہ ہو نہ ہو کوئی بلائے آسمانی آنے والی ہے۔ میرا پیارا، میرا بچہ۔ اس سال میرا ستارہ زحل ہے۔ سوگ منانے والوں سے میری قسمت کے ستارے کو چوٹ پہنچے گی۔ میں خوب جانتا تھا اسی لئے میں نے گھر سے باہر نکلنا قریب قریب چھوڑ دیا۔ مگر میں کیا کروں۔ بدقسمتی کا کوئی علاج نہیں۔ بدقسمتی نے تجھے کہاں پہنچا دیا۔ میں کھیتوں میں چلا جا رہا تھا وہاں وہ سوگوار ابھاگن نظر آگئی۔ پھر ایک اور واقعہ بھی ہوا۔ کل رات ارہی کی ماں نے خواب دیکھا تھا کہ عبادت گاہ میں ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔ یہ مندر کو ناپاک کرتا ہوا۔ جو بدشگونی اور بدقسمتی کی علامت ہے۔ بھلا بڈھوں کو کھیل تماشے سے کیا واسطہ۔ اس سے تو ان کے دھیان میں فرق پڑتا ہے۔ آج صبح ہی صبح پھر ایک بدشگونی ہوگئی۔ ایک کوّا پورب والے کمرے کی چھت پر اتر آیا اور بیسیوں بار اس نے وہاں منہ لٹکا کر کائیں کائیں کی۔ وہ بھی بدقسمتی کی خبر دے رہا تھا۔ میرے پیارے قسمت کی خرابی سہنی پڑے گی۔ بدنصیبی کا کسی کے پاس کیا علاج ہے"

وہ شاید اپنی بدنصیبی کے اور اسباب بھی سوچ سوچ کر بیان کرتا رہتا لیکن تھوڑی دیر بعد اُسے ہوش آیا کہ سارے پڑوسی وہاں سے کھسک چکے تھے۔ سننے والوں میں صرف اس کا خاندان رہ گیا تھا اور اس میں بھی ایک جوان بیٹا کم تھا جس کی خاطر یہ ساری مصیبت ٹوٹی۔

گھر میں اس رات بھلا کس کو قرار تھا۔ صرف وہ ننھی سی لڑکی تھی جس کی آنکھ لگ گئی۔ اسے ادہ ہی کی دلہن بننے کے لیے لیا گیا تھا۔ مگر ابھی وہ اتنی بچی تھی کہ معاملہ کتنا گمبھیر اور ٹیڑھا ہے وہ سمجھ نہ سکی۔ تاہم بھی کچھ بہت پریشان نہ تھا لیکن اس نے سعادتمندی کا فرض سمجھا کہ اپنے والدین کا پورا خیال رکھے اور انھیں سنبھالے رہے۔ کیونکہ انھیں پریشانی، غصے اور اشتعال کی وجہ سے دم بھر کو پلک جھپکنا مشکل تھا۔

پہلے تو وہ خوب ٹرٹراتا رہا اور خوب جھک جھک کر چکنے کے بعد اُسے چپ لگ گئی۔ ہاتھوں پر ٹھوڑی رکھ کر وہ دیر تک غور و فکر کرتا رہا۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ منہ پر انگلیاں مروڑنے اور مسلنے سے اُسے فیصلہ کرنے اور کسی نتیجے پر پہنچنے میں مدد مل رہی ہے۔ وہاں سے وہ اپنے تھلے پر پہنچا جہاں پیشین گوئی کرنے اور جنم پتری نکالنے بیٹھا کرتا تھا۔ اس نے تانبے کے تین سکے لیے تاکہ ان سے فال نکالی جائے۔ چھ بار اس نے پیسوں کو اس ڈبے میں پانسے کی طرح ڈال کر خوب بجایا جو ڈبہ صرف اسی مقصد کے لیے مقرر تھا۔ بجانے کے بعد وہ پیسے پھینکے۔ ان پر جو حروف لکھے تھے ان کی ترتیب کبھی ٹوٹی ہوئی ہوتی تھی کبھی جڑی ہوئی اور ہر بار ان سے ایک غیبی اشارہ ہوتا تھا۔ کبھی ینگ کبھی یانگ۔ سکوں کے ملانے سے وہ یہ نتیجہ نکال لیتا تھا کہ لائن بدلی یا وہی رہی۔ جو نتیجہ برآمد ہوا اس پر

چہرے کا رنگ بدل گیا اور تیزی کے ساتھ وہ حساب لگانے بیٹھ گیا۔

افوہ! یہ کیا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا کہ کاٹو تو لہو نہیں بدن میں۔ "غضب ہو گیا۔ عذاب الٰہی۔" اس نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔ "توبہ، توبہ اندھیر ہے دوپہر کی بھٹی کے بھٹنے گرڑ بڑائے ہوئے ہیں۔ آگ، شعلے اٹھ رہے ہیں۔۔۔ خوف ناک بات ہے۔ بہت خوف ناک۔"

اور پھر فال کو دیکھ کر وہ مسلسل بڑبڑاتا گیا۔ "میں پہلے ہی اس کے خلاف تھا کہ وہ بن جائے۔ کیا کہتے ہیں اس کو "جاپانیوں کی مخالف نوجوان سبھا" اس کا کپتان بنے۔ میں نے اسے منع کیا تھا۔ مگر وہ پاجی کہیں کا، اسے تو بڑا بننے کی سوجھ رہی تھی۔ دوسروں کے سر پر چڑھنے کی تمنا تھی اُسے۔ اب وہاں لے گئے ہیں۔ مارشل لا کے مطابق مقدمہ چلے گا۔ اگر وہ کپتان نہ بنتا تو یہ دن کیوں دیکھنا پڑتا۔ عام شہری کی طرح اس پر مقدمہ چلتا یوں ہی معمولی طریقے سے۔ یہ کم بخت مارشل لا کی مصیبت تو نہ ہوتی۔"

اب اس کی غم ناک پیش گوئیوں میں اس کی بیوی کی آہ و بکا بھی شامل ہو گئی تھی۔ چاہے میاں بیوی اسے مانتے یا نہ مانتے لیکن یہ عریاں حقیقت ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال رہی تھی کہ شیاؤ ارہ ہی گرفتار ہو چکا ہے اور اس کے دشمن کافی مضبوط ہیں۔ اب کیا کیا جائے؟

ماں نے غم و یاس کے عالم میں ہاتھ ٹیکتے ہوئے بین کیا۔ "میرے ننھے بھلا کسے گمان تھا کہ تو اور ایسی بلا میں پھنس جائے گا۔"

ماں کی آہ و زاری بلند سے بلند ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ خود چھوٹے بیٹے تا ہی کو اس پر مجبور ہونا پڑا کہ وہ ماں کو تسلی دے اور آنسو پونچھے۔ "ماں ڈرو مت۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ جو ہونا ہوتا ہے وہ ٹلتا نہیں۔ ہو جانے دو۔ مجھے

تو منٹ بھر کے لئے بھی یہ گمان نہیں گزرتا کہ یہ کوئی زندگی اور موت کا سوال ہے
میرا خیال ہے کہ بھائی صاحب نے کوئی بہت بڑا جرم نہیں کیا ہوگا۔ مگر اب تو انھیں ضلع
سرکار کی عدالت میں بھیج دیا گیا ہے۔ میں خود وہاں جاؤں گا اور دیکھوں گا۔
کر کیا کر سکتا ہوں۔ تم لوگ اب آرام کرو اور سو جاؤ۔"

جب وہ بول رہا تھا اس نے کاغذ کی ایک لالٹین روشن کر لی تھی۔ اسی لالٹین
کو ایک ہاتھ میں لٹکا کر وہ رات کی مسافت طے کرنے باہر چلا گیا۔

تاہی کے گھر سے نکل جانے کے بعد کننگ منگ اس فال کی تعبیر جاننے کے لئے پھر
پہنچا جو اس نے نکالی تھی۔ کاغذ کے ایک پرزے پر جو اس نے آڑی ترچھی لکیریں کھینچ
رکھی تھیں اس پر مزید غور کرنے کے لئے اس نے اپنا سر جھکا لیا۔ پھر اوپر سے نیچے اور نیچے
سے اوپر تک خوب غور کیا۔ ہونٹ چباتا رہا۔ زیر لب بڑبڑاتا رہا اور نئے سرے سے حساب
لگاتا رہا۔ اس کے چہرے کے آثار دیکھ کر یہ ضرور معلوم ہوتا تھا کہ اس غور و فکر اور حساب
سے اسے کچھ نہ کچھ ذہنی تسکین مل رہی ہے۔ اس کی آنکھیں فکر کرتے کرتے سر سے
باہر نکلی پڑتی تھیں۔ کیسا خوف ناک نتیجہ اس سے نکلتا ہے۔ اُف۔ یہ ہے تو پھر بیٹا
کیسے بچے گا۔ فال تو کہتی ہے کہ اس کا گرفتار ہونا اور پھانسی پانا برابر ہے۔ اے میرے
پیارے۔ اے میرے بچے، کراہتے کراہتے اس کا سر کھلے ہوئے بازوؤں میں ڈوبتا
چلا گیا۔

کتنی دیر تک وہ یوں ہی بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ اسے خود معلوم نہیں۔ لیکن دور
سے ایک عورت کے بین کرنے کی آواز نے اسے چونکایا اور اس نے نالوں سے سر اٹھا لیا کہ
سُنے یہ کون روتا پیٹتا چلا آرہا ہے۔ گریہ و زاری کی صدا قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی
تھی جو ثبوت تھی اس بات کا کہ آنے والی خود اس کے دروازے کی طرف آرہی ہے
رونے پیٹنے والی اور اس کا گریہ و زاری دونوں کننگ منگ کی کھڑکی کے نیچے پہنچ گئے

تھے اور ایک لمحہ بعد ان سب کا داخلہ اس کے دروازے میں ہو چکا تھا۔

اس سے پہلے کہ کنگ منگ دیکھے کہ آنے والی کون ہے۔ اس عورت نے لپک کر بڑے میاں کا بازو پکڑ لیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر اور گڑگڑاتے لہجے میں اس نے کنگ منگ کو ڈانشا یہ بتاؤ، تم میری بچی کو میرے حوالے کرو۔ تمھارا بیٹا میری بچی کو اغوا کر کے کہاں لے گیا۔ بتاؤ کہاں لے گیا۔ میری بچی۔ لاؤ میری بچی، مجھے دو"

یہ پری زاد سوم تھی۔ اس پر نظر پڑتے ہی غصے کے مارے کنگ منگ کی بیوی کے سر سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ کوئی بھی گڑبڑ، کوئی ہنگامہ ہو لیکن یہ عورت کہیں نہ کہیں اس کی تہہ میں ضرور ہوتی ہے۔ حرافہ کہیں کی۔ سوچے سمجھے بغیر کنگ منگ کی بیوی تخت سے اچھل کر آئی اور بے چاری قسمت کی ماری لافانی ہستی پر ٹوٹ پڑی۔ جس کے ہاتھ سے بیٹی پہلے ہی نکل چکی تھی۔

"اچھا ہوا جو تم آگئیں۔ تم نہ آتیں تو مجھے پہنچنا پڑتا۔ میری مصیبت کم ہوگئی تم دونوں ماں بیٹیوں نے میرے بچے کو بہکا لیا۔ اور اب بھی تمھاری یہ ہمت ہوئی کہ اُلٹا ہم سے پوچھو۔ وہ کدھر گیا۔ چلو۔ ضلع سرکار کے دفتر چلیں گے۔ وہاں پتہ چلے گا کہ کون مجرم تھا۔ اور سب کس کا کیا دھرا ہے"

یہ کہتے ہی وہ پری زاد پر دھتّڑ لگانے بڑھی۔ ایسا دھتّڑ جو عمر میں پہلی بار اس کے پڑا ہو گا۔ دونوں ادھیڑ عورتیں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوگئیں۔ اور گیند کی طرح زمین پر گدّے کھانے اور گھومنے لگیں۔

بڑے میاں نجومی اس منظر کو ویسے ہی ہڑبڑائے ہوئے دیکھ رہے تھے جیسے وہ تھوڑی دیر پہلے فال بد کو دیکھ چکے تھے۔ کنگ منگ نے اول اول کچھ کمزوری کوششیں کیں کہ وہ زنانہ غضب ناکیوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دے۔ اس کوشش میں بے چارہ کئی بار ادھر سے اُدھر چھلانگ لگاتا پھرا۔ جیسے گرم اینٹ پر بلّی کودتی ہے۔

لیکن اس ڈر سے کہ کہیں اس لپیٹ میں آکر خود میرے ہاتھ پیر کام سے نہ جائیں، وہ اتنے فاصلے پہ کھڑا ہو گیا کہ وہاں چوٹ چپیٹ لگنے کا اندیشہ نہ ہو۔ یہ جو ناگہانی طوفان برپا ہو گیا اس نے کنگ منگ کے دل و دماغ سے فال بد کے سارے خیالات اور ساری فکریں کم از کم تھوڑی دیر کے لئے ضرور غائب کر دیں۔

اگر بڑی ناد سوم بھی کہیں اتنی ہی بد حواس اور بوکھلائی ہوئی ہوتی جتنی کنگ منگ کی بیوی تھی تب تو یہ جنگی معرکہ بہت زیادہ تباہی پھیلا کر ختم ہوتا۔ لیکن ہم لوگوں کو تو معلوم ہے کہ اس کا غم ایسا تھا کہ کچھ اصلی اور کچھ بناوٹی۔ چنانچہ اس کے حواس بجا تھے جب اس نے دیکھا کہ مدِ مقابل نے جواباً گھونسوں اور مکوں کی بوچھار کر دی ہے تو اس کی یہ دلی خواہش کہ ہنگامہ پیدا کرے، بڑی تیزی سے کافور ہونے لگی۔ اور اگرچہ اسے لوگوں کی توجہ کا مرکز بننے کی تمنا بہت رہا کرتی تھی مگر اس نازک وقت میں اس نے فیصلہ یہی کیا کہ فرش پر مٹی بن کر پڑے رہنے سے بہتر ہے کہ توجہ کا مرکز بننے کے لئے دوسرے طریقے اختیار کئے جائیں زرا ظہور تو اس نے مقابلہ کرنے کی کوشش کی مگر ایک بار بڑی بی کے پنچے سے نکل کر وہ وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

کنگ منگ کی بیوی ابھی تک جوشِ جہاد میں کھڑی ہوئی تھی وہ پیچھے لپکی کہ اگر مدِ مقابل ہاتھ آجائے تو اسے کھینچ کر پھر لائے اور پھر مارے لیکن عین اسی وقت وہ دوسری لافانی اور امر ہستی یعنی اس کا شوہر راستے میں دیوار بن کر کھڑا ہو گیا۔ کنگ منگ نے دونوں بازو پھیلا کر اسے روک لیا۔ ایسی حالت میں وہ شوہر کو جھٹک کر دشمن کی آنکھیں نکالنے نہیں جا سکی۔ لیکن جب تک اس کے سینے میں سانس نے ساتھ دیا وہ برابر ایک سے ایک بڑھکر گالیوں، کوسنوں کی بوچھار کرتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد بڑی ناد سوم بھی دھیرے دھیرے اپنے گھر کی محفوظ پناہ گاہ میں پہنچ گئی اور اپنی قسمت کے ستارے کا شکر ادا کرتی رہی کہ چلو کچھ بھی ہوا مگر اس کا ملکوتی چہرہ تو نہیں بگڑا۔

(۱۰)

رحم کے لئے نجومی کی دُعائیں

ساری رات کنگ منگ نے تڑپ تڑپ کر کاٹی ۔ اور وہ کراہ کراہ کر کہتا رہا: "تاہی کیوں واپس نہیں آیا؟ تاہی کہاں رہ گیا" دوسرے دن ابھی صبح نہ ہوئی تھی کہ وہ ضلع سرکار کے دفاتر کی طرف چل دیا۔

ابھی سڑک پر اس نے آدھا راستہ طے کیا ہوگا کہ ذرا فاصلے سے سرکاری ملازموں جیسا ایک گروہ نظر آیا۔ جب یہ لوگ قریب پہنچے تو اس نے دیکھا کہ "تاہی ان لوگوں کے بیچ میں تھا۔ اس کے اِدھر اُدھر تین فوجی سپاہی تھے اور وہ سرکاری ملازم تھے جو کمیونسٹ کا رکن دکان پر کی سی بھورے رنگ کی وردی پہنے ہوئے تھے۔ یہ دوسری چوٹ تھی۔ کیا "تاہی بھی گرفتار ہو گیا؟ بوڑھے کی داڑھی غم و ملال سے لرزنے لگی۔

اس کے حلق میں آواز پھنس کر رہ گئی۔ اور بڑی مشکل سے کئی منٹ تک وہ پھندے سے نکلنے کی کوشش میں بلبلاتا رہا۔ بالآخر وہ گھٹی ہوئی آواز میں بولا: "تاہی، بیٹا کیا ہوا؟ کیا کوئی مصیبت ہے؟"

اس وقت تک وہ لوگ تاہی کے برابر آ پہنچے۔ تاہی کے جواب میں جو اطمینان اور بے نیازی سی تھی اس نے بوڑھے کو بھی مطمئن کر دیا۔ "سب خیریت ہے۔ آبا آپ گھبرائیے نہیں۔"

بوڑھے نے اور بھی اطمینان کا لمبا سانس لیا جب اس نے دیکھا کہ تینوں سپاہی اور ایک سرکاری ملازم اسے اس طرح چھوڑ رہے ہیں جیسے بیٹے کو باپ کے پاس خیریت سے پہنچا کر ان کا فرض ادا ہو گیا۔ جب تک رائفلیں اور سنگینیں نظر آتی رہیں وہ اس احساس سے بے نیاز نہ ہو سکا کہ کوئی نہ کوئی سرکاری حراست میں ضرور ہے لیکن جب وہ لوگ سڑک پر جانے لگے اور نظر سے اوجھل ہونے لگے تب اس نے تاہی کے منہ سے خوش خبری حاصل کرنے کے لئے کان جھکائے۔

یہ خوش خبری بیٹا اپنے ساتھ لایا تھا۔

ایک آدمی جو سرکاری ملازموں میں سے رہ گیا تھا اسے خطاب کرتے ہوئے تاہی نے کہا۔ "یہ میرے ابا ہیں۔" پھر وہ شخص اس کی طرف مڑتے ہوئے بولا "یہ صاحب ضلع سرکار کے دفتر کے آدمی ہیں۔ انھیں بھیجا گیا تھا کہ آپ کو اور شیاؤچن کی ماں کو بلا کر لائیں۔" اس نے جیسے ہی محسوس کیا کہ اس خبر سے باپ گھبرا گیا، وہ فوراً بولا "آپ جائیے ابا۔ سب ٹھیک ہو گیا۔ ارہ ہی اور شیاؤچن کو ضلع سرکار کے دفتر پہنچتے ہی رہا کر دیا گیا۔ وہاں پورے حالات کو وہ لوگ خود سمجھ گئے۔ کیوں کہ ژنگ وانگ اور چن وانگ کے متعلق ان کی رائے اچھی نہیں تھی۔ اب سارا مقدمے کا رُخ انھیں دونوں کے خلاف پھر گیا ہے۔ دونوں گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ یہ سرکاری افسر جو ہمارے ساتھ آئے تھے وہ ضلع سرکار کے نائب سکریٹری ہیں۔ سرکار نے انھیں اس کام پر مامور کیا ہے کہ ہمارے گاؤں پہنچ کر ایک عام جلسہ بلائیں اور وہاں سب کے سامنے ژنگ وانگ اور چن وانگ کی ان حرکتوں کا پول کھولا جائے جو وہ اتنے برس سے کرتے رہے ہیں۔ ان کے سیاہ کرتوت بھی بہت ہیں۔ کچھ تو کھلم کھلا جرائم ہیں اور کچھ ایسے کہ انھوں نے اختیارات کا غلط استعمال کیا ہے جب میں پہنچا تو تحقیقات مکمل ہو چکی تھی۔ ارہ ہی اور شیاؤچن کو رہا کر دیا گیا تھا۔ میں نے تو سنا ہے کہ حکومت نے انھیں بیاہ کرنے کی اجازت بھی دے دی ہے۔"

تاہی جب بول رہا تھا تو باپ کا کھویا ہوا اعتماد پھر بحال ہو رہا تھا مگر اس کے ساتھ مزاج کا ضدی اور اٹل پن بھی واپس آ گیا جو اس کے جوابی جملے سے ابھر آیا "خیر یہ تو اچھا ہوا کہ اس نے جرم نہیں کیا تھا لیکن دونوں کی شادی نہیں ہو سکتی۔ ان کی قسمت کے ستارے ٹکراتے ہیں، میہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ مگر تم نے یہ پتہ نہیں چلایا کہ وہ مجھے کس لیے بلانا چاہتے تھے؟"

تاہی نے اس کا جواب دیا "نہیں۔ آپ جائیے۔ اس سے زیادہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میں گھر جاتا ہوں تاکہ ماں کو خبر کر سکوں۔"

سرکاری ملازم نے بھی کہا "ہاں۔ آپ تو چل ہی لیے۔ اب میں جا کر دوسرے فریق کو

بھی سرکاری پیغام پہنچاتا ہوں۔"

اس پر دونوں ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ اور کنگ منگ ضلع سرکار کی طرف سر جھکائے ہوئے خیالات میں گم روانہ ہو گیا۔

جب وہ وہاں پہنچا تو اس کی پہلی ہی ترش نظروں نے کیا دیکھا کہ شیا وُ ارہ ہی اور شیا وُ چن دونوں فاختہ کے جوڑے کی طرح اطمینان سے دفتر میں ایک بنچ پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

اپنے بیٹے کی طرف انگلی اٹھا کر اس نے غصے اور بے بسی میں چیخ ماری۔ "پاجی۔ کمینے کہیں کے گڑ بڑ کر کے تو نے سب کو مصیبت میں ڈال دیا۔ جب یہاں سے چھٹکارا ہو تو خبردار جو گھر میں گھسا۔ خوف اور غم سے تو اپنے بوڑھے باپ کی جان لے کر رہے گا۔ بے شرم کمینہ۔"

ضلع افسر نے بڑے میاں کو روکا۔ "کیا کرتے ہو۔ یہ ضلع سرکار کا دفتر ہے۔ گالیاں بکنے کی جگہ نہیں ہے۔"

اعلیٰ افسر کے دباؤ میں آکر بوڑھے جوتشی نے اپنی لعنت ملامت کے باقی ذخیرے کو اس وقت تک کے لئے روک لیا جب تک اس کا بیٹا دوسروں سے علیحدہ نہ ہو جائے۔ ضلع حاکم نے تحقیقات کرتے ہوئے سوال کیا۔ "کیا تم ہی لیو شن تے ہو؟"

"جی ہاں"

"کیا تم نے اپنے بیٹے لیو ارہ ہی کے لئے کوئی بچی منگیتر بنا کر لی ہے؟"

"جی ہاں"

"اس کی عمر کیا ہو گی؟"

"وہ بندر والے برس پیدا ہوئی تھی۔ اب اس کی عمر بارہ سال ہو گی۔"

"جس لڑکی کی عمر پندرہ سال سے کم ہو اُسے قانونی لحاظ سے منگیتر نہیں بنایا جا سکتا۔ تم اسے اس کے والدین کے پاس گھر بھیج دو۔ کیونکہ لیو ارہ ہی کی منگنی یا رسمی وابستگی اب یو شیا وُ چن نامی لڑکی سے ہو چکی ہے۔"

"اب اسے واپس نہیں بھیجا جا سکتا۔ مجھے پتہ نہیں کہ اس کے کنبے والے کہاں ہیں اور کون ہیں۔ صرف اس کا ایک باپ تھا جسے میں جانتا ہوں۔ وہ قحط کے زمانے میں پناہ گزیں بن کر آیا تھا۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں چلا گیا۔ آپ کہتے ہیں کہ پندرہ برس سے کم عمر میں لڑکی کی منگنی طے نہیں ہو سکتی۔ ممکن ہے یہ قانون آپ کی سرکار نے بنایا ہو لیکن ہمارے یہاں تو دیہات میں تو نہ جانے کتنی لڑکیاں ہیں جن کی منگنی سات آٹھ برس کی عمر میں ہی ہو جاتی ہے۔ یہ ہمارے یہاں کا رواج ہے حضور والا مجھ پر رحم کیجئے اور معاف کر دیجئے۔"

"اس طرح سے جو منگیاں خلاف قانون ہوں گی۔ اگر دونوں فریقوں میں سے کسی کو بھی ان پر اعتراض ہو گا تو وہ منگیاں توڑ دی جائیں گی اور شادی کی اجازت نہ ہو گی۔"

"لیکن جناب یہاں تو دونوں فریق اس پر رضامند ہیں۔ کسی کو اعتراض نہیں ہے" بوڑھے نے کہا۔

ضلع حاکم نے شیاڈ ابرھی کو آواز دی۔ "کیوں فریق۔ لیوانو ہی تمہیں وہ شادی منظور ہے؟"

"جی نہیں" اس نے ہی سختی سے بولا۔ "میں اس رشتے کے خلاف ہوں۔" یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے اس نے باپ کی آنکھوں سے آنکھیں نہیں ملائیں۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے فیصلہ کر لیا۔ کیوں؟" کونگس منگ زور سے چلایا۔ اس کا غصہ اور جھلاہٹ ان تیکھی نظروں سے ٹپک رہی تھی جو اس نے بیٹے کی طرف ڈالیں۔

اس کے جواب میں خود ضلع حاکم کی طرف سے دوسری تنقیح آئی۔ "اگر وہ اپنی شادی کا فیصلہ کرنے والا نہیں ہے تو اور کون فیصلہ کرے گا؟ تم کرو گے؟ بڑے میاں بہتر ہے کہ میں آپ کو بتا دوں کہ شادی اب ایک خوشی کا سودا ہے۔ آپ کی خواہشات اور تمناؤں کو اس میں دخل کم رہ جاتا ہے۔ اگر وہ منگیتر اپنے گھر خاندان والوں کو واپس نہیں بھیجی جا سکتی تو مناسب یہی ہے کہ آپ اسے بیٹی بنا لیں۔"

"ہاں یہ تو ہو سکتا ہے۔" بڑے میاں بولے۔ "مگر حضور والا۔ میں پھر آپ کا رحم اور

درگزر کی درخواست کرتا ہوں ۔ آپ اس معاملے میں عنایت و نوازش سے کام لیجیے چاہے صورت کوئی بھی ہو لیکن میرے لڑکے کی شادی یوفو کی لڑکی سے نہ ہونی چاہیے "

"مگر آپ کو شادی روکنے کا کوئی اختیار نہیں ہے "

یہ سنتا تھا کہ کنگ منگ پاؤں پٹک کر رہ گیا اور اس نے پریشانی کے عالم میں اپنے ہاتھ مروڑنے شروع کر دیے "حضور میں آپ سے التجا کرتا ہوں ۔ حاکم صاحب! میں آپ سے رحم کی التجا کرتا ہوں ۔ رحم کیجیے ۔ یہ کبھی دونوں ساتھ نہ رہ سکیں گے ۔ ان کی جنم پتری میں نے دیکھی ہے ۔ دونوں کے ستارے لڑتے ہیں ۔ آپ سوچیے تو ۔ ان دونوں کی شادی ہوئی تو دونوں عمر بھر آفتوں میں پھنسے رہیں گے "

شیاؤ ارہ ہی کی طرف مڑتے ہوئے اس نے پھر خبردار کیا "ارہ ہی بیٹا ، پاگل مت بن ۔ سوچ تو کتنا اہم فیصلہ تو کر رہا ہے ۔ تیری ساری زندگی کا سوال ہے "

ضلع حاکم نے تیزی سے میز پر گھونسا مارا تاکہ بوڑھے جوتشی کی توجہ اس طرف ہو ۔ "بڑے میاں ناسمجھی کی بات تم بھی مت کرو ۔ تم چاہتے انیس برس کے جوان بیٹے کو مجبور کر رہے ہو کہ وہ دس بارہ برس کی بچی سے بیاہ کر لے اس سے ہر شخص کو بعد میں مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ تمھارا بیٹا بھی عمر بھر اس کا بھگتان بھگتے گا ۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ واقعات اور حالات کو صحیح روشنی میں دیکھنے کی طرف تمھیں متوجہ کر دوں ۔ اگر دو جوان مرد عورت آپس میں شادی بیاہ طے کرتے ہیں تو تمھاری مرضی یا رضامندی حاصل کرنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی ۔ اب تم اپنے گھر جا سکتے ہو ۔ اور اگر اس منگیتر بچی کو اس کے گھر واپس نہ بھیج سکو تو مناسب یہی ہوگا کہ اسے اپنی بیٹی بنا کر رکھ لو "

کنگ منگ کو بحث سے خارج کر دیا گیا اور وہاں سے ہٹا دیا گیا ۔ مگر وہ برابر چلا تا رہا "حضور والا ۔ رحم کیجیے ۔ صرف رحم "

رحم کی درخواست کرتے کرتے اسے دفتر کے ایک چپراسی نے ضلع حاکم کے کمرے سے باہر کر دیا ۔

(۱۱)

پری زاد سوم پر ایک نظر

پری زاد جو اپنے گھر سے نکل کر سیدھی کنگ منگ کے یہاں بین کرتی ہوئی پہنچی تھی اس کا کچھ تو مقصد یہ تھا کہ جھگڑا کرنے اور ہنگامہ برپا کرنے کی جو قابلیت اس میں ہے اس کا ایک تماشا دکھادے گی اور کچھ یہ کہ ہمسایوں کی آنکھوں میں دھول جھونک دے گی اور انھیں پتہ نہیں چلنے پائے گا کہ بیٹی ماں کے تعلقات اس معاملے میں کس قسم کے ہو گئے تھے۔ مگر جہاں تک بیٹی کے متعلق فکر مند یا پریشان ہونے کا تعلق ہے اس کے دل کو اتنی بھی فکر نہ تھی جتنی اس چڑیا کو ہو گی جو کھلی ہوا میں مزے سے پرواز کرتی ہے۔ بلکہ سچ پوچھو تو اسے دلی خوشی تھی کہ چلو اچھا ہوا، شباؤچن کو ذرا مزا تو چکھنا پڑے گا۔ چناں چہ جب وہ کنگ منگ کی بیوی سے لڑ جھگڑ کر اپنے گھر واپس آئی تو خوب پیر پھیلا کر اور پورے سکون قلب کے ساتھ میٹھی نیند سوئی۔

دوسرے دن صبح دن چڑھے تک وہ بستر پر پڑی رہی۔ بے چارہ بھولا بھالا سادہ لوح یوفو بہت گھبرایا ہوا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایسے حالات میں اسے کیا کرنا چاہیے اور کیسے نپٹنا چاہیے۔ اس کی اتنی جرأت نہ تھی کہ بیوی کو خواب سے بیدار کر سکے یا چھیڑ سکے۔ وہ منتظر رہا یہاں تک کہ خود پری زاد موصوفہ کی پاک و برتر مرضی ہوئی کہ وہ اپنی حرکات سے یہ ظاہر کرے اب بستر سے اٹھنا چاہتی ہے۔ وہ ابھی غسل اور بناؤ سنگار میں مصروف تھی کہ شوہر غریب نے دوپہر کا کھانا تیار کر دیا۔ اور چوں کہ موصوفہ نے تیار ہونے میں کافی دیر لگائی اس لئے بالکل اندیشہ تھا کہ آج پھر وہ دن نہ آ جائے کہ دلیا ضرورت سے زیادہ پک چکا ہو۔

ابھی وہ ایک ٹھسے دار خاتون کی طرح سے اپنی زلفیں سنوار رہی تھی کہ یوفو نے پوچھا "کچھ تمھیں شباؤچن کی بھی فکر ہے۔ تم نے پتہ چلایا کہ اس پر کیا گزری؟"

"فکر کرنے اور پتہ چلانے سے کیا حاصل؟" دیوی جی نے الفاظ چبا کر ارشاد فرمایا۔ "وہ خود اچھی طرح جانتی ہے کہ اپنا خیال کیسے رکھے۔"

یوفو کی اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اس سوال پر اور زیادہ زور دے سکتا یا تکرار کر سکتا۔ وہ باورچی خانے کی طرف لوٹ گیا اور پھر کھانا تیار کرنے میں لگ گیا۔ جب کھانا تیار ہو گیا تو اس نے آتش دان پر رکھ دیا تاکہ گرم رہے اور انتظار کرتا رہا۔ اس وقت تک جب تک کہ موصوفہ محترمہ کی آرائش مکمل نہ ہو گئی۔

کئی سال سے جو دستور گھر کا چلا آ رہا تھا اسی کے مطابق شوہر نے دیوی کی خدمت پورے طور پر ادا کی۔ میز سرکائی۔ اس پر کھانا چنا اور سارے کام انجام دیئے۔

ابھی کھانے کا سلسلہ جاری تھا کہ سرکاری نمائندہ پری زاد سوم کو ضلع سرکار کی طرف سے بلانے آ پہنچا۔

اس نے بہ ظاہر بڑے اطمینان سے یہ خبر سنی۔ "ہماری بیٹی اب کافی سیانی ہو گئی ہے اور اب وہ ہماری دیکھ بھال کی حد سے آگے نکل گئی ہے"۔ اس نے یہ الفاظ نہایت پر اثر طریقے پر دھیمی اور کچھ بلند بھی آواز میں کہے "میں خود ضلع حاکم سے عرض کروں گی کہ وہ ہماری طرف سے اسے تمیز سکھائیں اور ٹھیک کریں"۔

جانے کی تیاریوں میں بڑا وقت لگ گیا کیوں کہ اسے باہر نکلنے کے لئے ساری آرائشیں تمام بناؤ سنگار پھر سے کرنا پڑا۔ ایسے اہم اور خاص موقعے کے لئے پری زاد نے اپنا سب سے نیا اور سب سے زیادہ بھڑکیلا لباس زیب تن فرمایا۔ بنفشئی ریشم کی واسکٹ اس پر ہرے بادامی رنگ کا پاجامہ جس کے پائنچوں پر بڑی بڑی پھول دار بیلیں اور گوٹ لگی ہوئی تھی۔ سر پر بالکل نیا رومال۔ وہ رومال بھی ریشم کا۔ اور پیروں میں زرتار ٹکے ہوئے سلیپروں کی سب سے اچھی جوڑی چڑھائی۔

اپنے عمر رسیدہ اور شکن در شکن چہرے پر دوبارہ غازہ ملا۔ اور خاص خاص حصوں میں پھر سے تھوڑا سا روز (گلابی رنگ) بھرا۔ آرائش کی تکمیل کے طور پر اس نے اپنی چوڑی چکلی کلائیوں پر چاندی کی کچھ اور چوڑیاں چڑھائیں جس سے کلائیاں اور بھر گئیں اور اس کا ایک قدم پر ان کا چھنا کا بلند ہونے لگا۔ بالآخر اسے اطمینان ہو گیا کہ اب کسی کی کیا مجال جو جس ع

زیبائش میں میرا سامنا کر سکے۔ اور جب اس کی نیت میں یہ فتور بھی آ گیا کہ خود ضلع حاکم دیکھے گا تو میری کوشش کے پھندوں میں جکڑ جائے گا۔ تب اس نے پاک و بہتر حکم جاری کیا کہ اچھا ہمارا گدھا تیار کر کے لایا جائے۔

گدی پر وہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی اور اس کی شاندار سواری ضلع سرکار کی طرف چل دی۔ بے چارہ سادہ لوح بیوقوف اس کے گدھے کی لگام پکڑے برابر بھاری بھرکم بوجھ اٹھاتا ہوا اپنے فرائض انجام دیتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

جیسے وہ سرکاری دفاتر میں پہنچی فوراً سرکاری نمائندہ جو بلانے بھیجا گیا تھا اسے لے کر سیدھا دفتر کے اندر چلا گیا۔

ضلع حاکم اپنے ڈیسک پر رکھے ہوئے کاغذات کے انبار پر جھکا ہوا کچھ لکھ رہا تھا۔ وہ اندر پہنچتے ہی گھٹنوں کے بل جھک گئی۔

"عالی جناب حضور والا، حاکم ضلع۔ آپ خود فیصلہ فرما دیجیے" وہ زور سے چلائی "جو حضور مناسب سمجھیں فیصلہ فرما دیں۔"

ضلع حاکم نے گردن اٹھا کر جو دیکھا تو اس کی نظر ریشمی نفیس ملبوسات کی ایک ڈھیری پر پڑی جو فرش عدالت پر سمٹی ہوئی تھی۔ ضلع حاکم سمجھا کہ یہ وہ دلہن ہو گی جسے ساس سے جھگڑا کرنے کے مقدمے میں طلب کیا گیا تھا۔

اپنے کاغذات پر پھر سے نظر جماتے ہوئے اور قلم کھینچتے ہوئے اس نے کہا۔ "دیکھو تمھاری ساس کی طرف سے ایک ضامن موجود ہے۔ تم اس سے بات کیوں نہیں کر لیتیں؟"

گورنر کے اس جملے پر وہ کچھ الجھن میں پڑ گئی اور اس نے گردن اونچی کی۔ ضلع حاکم کی نظر اس سے چار ہو گئی تب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ کیونکہ سامنے جو نیا وجود حاضر تھا وہ توحد سے زیادہ بنی ٹھنی ایک عمر رسیدہ عورت تھی جس کے

چہرے پہ بُری طرح رنگ و روغن تھپا ہوا تھا۔

سرکاری نمائندے نے کہا "یہ ہیں یہ شیاؤ چن کی والدہ۔"

گورنر نے بڑی گہری نظروں سے اس عورت کو سر سے پاؤں تک گھورا۔ اس ریشمی رومال سے لے کر جو عورت کے سر کے گنج کو چھپائے ہوئے تھا۔ اس کے زرتار لچکے پچھے والے سلیپروں کی نوک تک جائزہ لیا اور پوچھا "تو آپ شیاؤ چن کی والدہ ہیں؟ اُٹھیئے، یہاں دیوی وغیرہ بننے کی ضرورت نہیں ہے اور نہ اپنے کرشمے جتانے کی ضرورت ہے۔ مجھے سب معلوم ہے۔ اٹھ جائیے۔"

جب پری زاد سوم اپنے پیروں پر آہستہ آہستہ لڑکھڑاتی ہوئی اٹھی تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل چکی تھی۔ ضلع حاکم اپنے انتہائی روکھے لہجے میں سوال و جواب کرتے ہوئے بولا: "تمھاری عمر کیا ہے؟"

تمسخر آمیز مسکراہٹ تک چہرے پہ نہ آئی اور پری زاد نہایت فرض شناسی کے انداز میں بولی "۴۵ سال۔"

"ذرا اپنے اوپر ایک نظر ڈالو" ضلع حاکم نے استعجاب کے لہجے میں کہا "اور سوچو کہ تم نے جو لباس زیب تن کر رکھا ہے کیا یہ تمھاری عمر کے کسی انسان کو زیب دیتا ہے؟"

ایک چھوٹی سی بچی جو دروازے کے پاس کھڑی تھی یہ سنتے ہی چیخ مار کر ہنس پڑی۔ سرکاری اردلی دفتر میں انتظام اور سکون باقی رکھنے پر بہر حال خود کو محسوس کرتے ہوئے دوڑا اور اس نے بچی کو ڈانٹا "جاؤ۔ باہر جاکر کھیلو" بچی باہر چلی گئی اور پھر عدالتی کارروائی شروع ہوئی۔

"تو یہ بتاؤ، جب تم چاہتی ہو تو دیوی دیوتا آجاتے ہیں؟"

پری زاد سوم کو یہ وقت دیکھنا پڑا کہ وہ اپنے کرشموں اور معجزوں کا دعویٰ نہ کر سکی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ضلع حاکم بولتا رہا "بتاؤ۔ تم نے اپنی بیٹی کی شادی

کی بات کہیں طے کی تھی ؟"

"جی ہاں"

"تمھیں اس کے صلے میں کتنا روپیہ ملا ؟"

"تین ہزار پانچ سو"

"اور اس کے علاوہ کیا پایا ؟"

"ریشم اور ساٹن کے کچھ تھان اور زیور"

"کیا تم نے اس بیاہ کے معاملے میں بیٹی سے بھی کچھ گفتگو کی تھی ؟"

"جی نہیں"

"کیا تمھاری بیٹی اس رشتے پر رضامند ہے ؟"

"مجھے نہیں معلوم"

"اچھا یہ بات ہے ؛ تو میں تمھاری بیٹی کو یہاں بلواتا ہوں تاکہ تم خود اس سے سوال کر سکو۔ اور ضلع حاکم نے اہل کار یا اردلی کی طرف مڑ کر حکم دیا "جاؤ تو شیاؤ چن کو بلا لاؤ"

اسی دوران میں وہ بچی جو دروازے کے پاس قہقہہ مار کر زور سے ہنستی تھی۔ باہر جا کر اس نے سب کو خبر سنا دی کہ ۴۵ برس کی ایک بڑی بی آئی ہیں۔ ان پر مقدمہ چل رہا ہے۔ دیکھنے کے قابل چیز ہیں۔ بالکل دلہنوں کی طرح بنی ٹھنی۔ اور زرتار لچکے گوٹے کے جوتے پہنے ہوئے۔ آس پاس کے سارے علاقے میں افواہ پھیل گئی۔ اور نوجوان عورتیں جنھیں ہر ایک نئی اور اجنبی چیز کو دیکھنے، تاکنے جھانکنے کی بڑی بے چینی ہوتی ہے دھیرے دھیرے عدالت کے احاطے میں جمع ہو گئیں کہ دیکھیں کیا تماشا ہے۔

ایک دوسری کو کہنیوں کا ٹھوکا دے دے کر اور گردنیں نکال نکال کر اور

تیوریاں چڑھا کر انھوں نے جملے کسے جو دوسروں کے کانوں تک بھی پہنچتے تھے۔ "لو، اور دیکھو۔ آپ اور ۵۰ برس۔ زرا پاجامے کی گلکاری اور گوٹ دیکھو۔ جوتیاں۔ ارے واہ کیا جوتیاں ہیں۔ چہرے پہ لالی بھی ملی ہے۔ دیکھو زرا ٹھاٹھ۔"

پری زاد سوم جسے پچھلے بیس برس میں کبھی جھینپنا نہیں پڑا تھا، ایسا محسوس کرنے لگی جیسے اس کے چہرے میں رنگ ڈوبتا جا رہا ہے۔ ایک رنگ آتا تھا اور ایک جاتا تھا۔ پہلے وہ شرم کے مارے سُرخ ہو گئی اور پھر چہرہ بالکل چمپئی ہو گیا عرقِ ندامت کی ننھی ننھی بوندیں اس کے چہرے پر اُچھل آئیں اور رخساروں سے بہہ نکلیں۔

اس دوران سرکاری آدمی بھی شیاؤ چن کو بلا لایا تھا۔ احاطے میں عورتوں کا جو ہجوم تھا اس سے دھکا پیل کرتے ہوئے اور آگے بڑھنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے خاص منشا سے ذرا بڑھا چڑھا کر پکارا: "تم لوگ یہاں کیا دیکھ رہی ہو؟ وہ بھی آخر انسان ہے۔ نہیں کیا؟ کیا تم نے اب سے پہلے کبھی اس طرح کی عورت نہیں دیکھی۔ راستہ دو آگے جانے کا۔" اس پر عورتیں ہنسی کے مارے لوٹنے لگیں اور ایک دوسری کو شرارت سے نوچتی جا رہی تھیں۔

شیاؤ چن کو عدالت نے بلوایا تھا۔ ضلع حاکم نے پری زاد کو حکم دیا "اب تم پوچھو اپنی بیٹی سے کہ تم نے جو رشتہ اس کے لئے طے کیا تھا وہ اس پر رضامند ہے کیا؟"

مگر پری زاد کی وہ حالت تھی کہ زبان سے لفظ ادا نہ ہوتا تھا۔ وہ بار بار اپنے تمتماتے ہوئے ماتھے کو صاف کرتی تھی اور ان جملوں پر اس کے حواس غائب ہوتے جا رہے تھے کہ "۵۰ برس کی ہے۔ لچکے گوٹے کی جوتیاں پہن کر چلی ہیں۔ زرا پاجامہ دیکھو۔" اب اس میں نئے جملے بھی شامل ہو گئے تھے مثلاً یہ کہ: "وہ اس کی بیٹی ہے۔ بیٹی تو ماں کی طرح بھی بنی سنوری نہیں ہے۔" دوسرے لوگ کہے جا رہے تھے: "دیوی جی

آتی ہیں۔ ان پر انتہائی بدقسمتی کی بات یہ ہوئی کہ ہجوم میں کسی کو وہ بدنام کہانی بھی معلوم تھی "دلیا زیادہ پک گیا" والی۔ اس نے وہ جملہ کس دیا۔ اس کا سننا تھا کہ پری زاد پر وہ چوٹ لگی کہ بس نہیں تھا جو زمین پھٹ جائے اور وہ اس میں سما جائے۔

کچھ سوچ کر ضلع حاکم نے کہا: "اگر تم اپنی بیٹی سے سوال نہیں کرو گی تو پھر میں پوچھوں گا۔ یو شیا وچن، تمھاری ماں نے تمھارا رشتہ ایک شخص سے کیا ہے۔ کیا تم اس سے شادی کرنے پر رضامند ہو؟"

"جی نہیں، ہرگز نہیں!" شیا وچن نے کہا۔ "مجھے کیا معلوم وہ کون ہے؟"

پری زاد کی طرف مڑتے ہوئے ضلع حاکم نے سوال کیا: "تم نے سن لیا؟" اس کے بعد حاکم نے وہ قانون پڑھ کر اور تشریح کر کے سنا دیا جس کا مفہوم یہ تھا کہ شادی مرد و عورت کی رضامندی اور آپس کے فیصلے پر منحصر ہے۔ اب پرانے جاگیرداری جبر اور زبردستی کے مطابق ماں باپ کی من مانی پر اس کا دار و مدار نہیں ہے۔ اس طرح شیا وچن اور شیا ڈاوہی کی شادی قطعی طور پر قانونی اور جائز تھی۔ کیوں کہ یہ ان کی اپنی مرضی کے مطابق تھی اور وہ دونوں ہر طرح کی پابندیوں سے آزاد تھے۔ اس کے علاوہ ضلع حاکم نے پری زاد کو حکم دیا کہ جو رقم اور جو تحفے تم نے مسٹر وو سے لئے ہیں وہ سب واپس کرو۔ اس میں سے کچھ تم اپنے پاس مت روکنا۔ اور شیا وچن اور ڈاوہی کو اجازت دی کہ جب تمھارا جی چاہے تم شادی کر سکتے ہو۔

جھینپ، شرم، بدحواسی اور غیرت کے مارے پری زاد نے بغیر کسی جھجک اور دشواری کے اپنی رضامندی دے دی اور اپنے تمام کرشموں اور غیبی قوتوں کو بالائے طاق رکھ کر وہ احاطے میں بڑھی اور جملے کسنے اور معنی خیز ہنسی ہنسنے والی عورتوں کے ہجوم کو چیرتی ہوئی سیدھی باہر کی طرف روانہ ہو گئی۔ جہاں اس کا سادہ لوح شوہر لیو فو سواری لئے انتظار میں کھڑا تھا۔

وہ زیادہ دل گرفتہ اور زیادہ ہوشیار عورت تھی جب وہ گھر پہنچی اس نے گھر کی چوکھٹ پر قدم رکھتے ہی اپنی تمام ساحرانہ کرامات کا لبادہ اتار دیا۔ اور دوسرے دن سے جب وہ باورچی خانے میں گھسی اور اس نے گھریلو کام کاج کا بار اپنے شانوں پر لے لیا تو یہ اس بات کا کھلا اعلان تھا کہ وہ اپنی برتری اور امر شخصیت کے طلسم کو ٹھکرا چکی ہے۔

(۱۲)

آخر میں کیا ہوا

جب وہ تینوں سپاہی اور ضلع سرکار کا نائب کمیسار (نائب انچارج) کنگ ھنگ دوم اور اس کے کمسن بیٹے کو چھوڑ کر چل دیئے کہ وہ اپنے راستہ لگ جائیں تو وہ دونوں اپنے لیو کے دیہات میں گئے اور وہاں انھوں نے خبر پہنچادی۔ خبر یہ پھیلی کہ چن وانگ اور ژنگ وانگ گرفتار کر لئے گئے ہیں۔ اس خبر سے عام مسرت پھیل گئی اور لوگوں نے خوب شادیانے بجائے۔ اور جب انھوں نے لوگوں کو سنایا کہ نائب کمیسار کا یہ کام ہے کہ وہ دونوں دیہاتی فتنوں کے جرائم کی تحقیقات کرے تو خوشی دو چند ہو گئی اور باپ بیٹوں کا اور زیادہ جوش و خروش سے استقبال ہوا۔ تمام دیہاتی اس خبر مسرت اثر پر وقت آنے سے پہلے ہی خوب خوب تالیاں بجانے لگے۔

چناں چہ ظہر کے بعد دیہات کے عبادت گھروں میں مجمع عام ہوا تو حاضری بہت کافی تھی۔ گاؤں کے سردار نے جلسہ کا افتتاح اپنی تقریر سے کیا جس میں بتایا گیا تھا کہ جلسے کا مقصد کیا ہے اور اس کے بعد سب حاضرین سے درخواست کی گئی کہ جن دو مجرموں کے بارے میں تحقیقات جاری ہے ان کے متعلق جسے جو کچھ معلوم ہو اور ان کے جتنے کرتوت کی مثالیں موجود ہوں سب پیش کی جائیں۔

اول اول تو گاؤں والے بے زبان سے رہے۔ انھیں خوف تھا کہ وہ چین وانگ اور ژنگ وانگ کو ان کے مسندِ اقتدار سے نیچے نہیں اتار سکیں گے اور اگر انھوں نے زیادہ کھل کر بات کی تو ان کی شامت آجائے گی آگے چل کر کہیں کہ اگر اب انھیں آدھا موقع بھی مل گیا تو وہ ظالموں کی جوڑی دوگنا انتقام لے کر چھوڑے گی، چناں چہ سردار کے سوال کرنے پر بھی لوگ منہ پہ تالا ڈالے بیٹھے رہے۔ کوئی کچھ نہ بولا۔ سوائے اس کے کہ آپس میں کھسر پھسر ہوتی رہی جس میں اس طرح ہوشیار رہنے کے محتاط اشارے کئے گئے کہ "اگر ہم سمجھ سے کام لیں تو مصیبت زیادہ نہ ہوگی۔ خیریت اسی میں ہے کہ اپنی گردن آگے مت نکالو" وغیرہ

لیکن اتنے میں ایک نوجوان نے جلسے میں پہل کر ہی دی۔ اس بے ایمان جوڑی نے نوجوان کو تباہ و برباد کر ڈالا تھا۔ وہ بولا "کیا میں نے اس سے پہلے سمجھ اور ہوشیاری سے کام نہیں لیا؟ کیا میں نے ہر ظلم و جور پورے صبر و تحمل کے ساتھ نہیں سہا؟ لیکن میں نے اسے جتنا ضبط کیا ہے اتنا ہی بُرا مجھے محسوس ہوا اتنا ہی میرا سکونِ قلب غارت ہوا۔ اگر تم میں سے کوئی بھی زبان کھولنے کو تیار نہیں ہے تو میں شروع کرتا ہوں۔

پھر اس نے پوری داستان کہنی شروع کی کہ کس طرح چین وانگ ٹا کوؤں کو اس کے گھر لایا۔ کیسے اس کے گھر والوں کو اغوا کرایا۔ اسی طرح دونوں بھائیوں کے سیاہ کارناموں کے چار پانچ واقعات سے اس نے پردہ اٹھا دیا اور آخر میں اس نے کہا "اب آگے کچھ کہنے سے پہلے میں ذرا دم لینا چاہتا ہوں۔ بہتر ہے کہ اب دوسرے لوگوں کو بھی بولنے کا موقع دیا جائے۔"

گیند اب میدان میں آ گئی تھی، دوسرے قدم بڑھانے لگے۔ اب ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ میں بھی اپنی شکایات سنادوں اور مجھے بھی بولنے کا موقع ملے۔ کچھ ایسے

لوگ نکلے جنھیں چن وانگ اور ژنگ وانگ نے ڈرا دھمکا کر اس پر مجبور کیا تھا کہ وہ انھیں روپیہ پیش کریں۔ کچھ لوگوں کو ایسے واقعات یاد تھے کہ کس کس طرح ان دونوں نے مل کر بعض لوگوں کو خودکشی پر مجبور کیا۔ کسی کو مالی زبردستی یا غصب اور غبن کی شکایت تھی۔ کسی کو اپنی آبرو اور بیوی کے ناموس کا رونا تھا۔ ان دونوں کو یہ مرض بھی تھا کہ جو سرکاری ملازمین وغیرہ ان کے ماتحت تھے ان سے وہ اپنا ذاتی کام لیا کرتے تھے اور اس طرح ان ماتحت غریبوں کو بیگار بھی بھگتنی پڑتی تھی۔ کسی کو انھوں نے ایندھن کاٹ کر لانے کے کام میں لگایا تھا۔ کسی کو اپنے کھیت کی نلائی بوائی پر مامور کر رکھا تھا۔ انھوں نے لوگوں پر زیادہ ٹیکس لگائے تھے۔ اور خالتو رقم اپنی جیبوں میں بھر لی تھی۔ پبلک کا روپیہ غبن کرتے تھے۔ اور عوامی فوج کے سپاہی ان کے ماتحت تھے ان کے ہاتھوں زبردستی کر کے جسے چاہتے گرفتار کرا دیتے تھے۔ شاید ہی کوئی جرم ایسا ہوگا جو اس سے سرزد نہ ہوا ہو۔ کہیں سے کوئی فقرہ سننے میں آتا۔ کہیں سے کوئی نفرت و ملامت کے الفاظ سے یاد کرتا۔ کہیں سے کوئی الزام برآمد ہوتا۔ غرض دھیرے دھیرے ان کا سب کیا دھرا سامنے آگیا۔ دوپہر کے بعد سے لے کر غروب آفتاب تک جب جلسہ برخاست کیا گیا ویسی کوئی پچاس شکایات کی فہرست بن گئی جن پر دونوں بھائیوں پر جرم کرنے کا الزام تھا۔ ان کی تحقیقات بھی ہوئی اور اکثریت ایسے واقعات کی بھی جن کے مکمل ثبوت بھی موجود تھے۔

باقاعدہ تحریری ضابطہ مکمل کیا گیا۔ اور قیدیوں کو یہ فرد جرم دے کر ضلع کی عدالت میں بڑھا دیا گیا۔ وہاں چن وانگ اور ژنگ وانگ دونوں پر مقدمہ چلا۔ اور جب ان کے سارے کرتوت بالکل ثابت ہو گئے تو انھیں پندرہ پندرہ سال کی سزا با مشقت سنا دی گئی۔ اسی کے ساتھ یہ حکم صادر ہوا کہ ان کی جائداد ضبط کی جائے اور اس جائداد کی رقم سے ان لوگوں کو معاوضہ دیا جانے کا فیصلہ ہوا جن پر ان دونوں مجرموں نے

ظلم ڈھائے تھے۔

جب یہ جلسۂ عام ختم ہوچکا تو گاؤں والوں کو یقین و اعتماد محسوس ہونے لگا اب عہدوں پر چُنے جانے کے معاملے میں وہ اتنی ہچکچاہٹ نہیں دکھاتے تھے۔ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ گاؤں کے کارکنوں کا پھر سے چناؤ ہوا۔ مناسب آدمی عہدوں کے لئے چنے گئے۔ جو لوگ اس بار منتخب ہوئے انھوں نے زیادہ تکلف اور بناوٹ سے کام لئے بغیر اپنے عہدے سنبھال لئے۔ اور پھر یہ کہ جن لوگوں نے چناؤ میں ووٹ دیئے انھوں نے بھی اپنی ذمہ داری محسوس کی کہ ایسے آدمیوں کو چُنیں جو اچھے ہوں اور انھیں کامیاب نہ ہونے دیں جو چن وانگ اور ژنگ وانگ کی طرح پھر اپنے اختیارات کا غلط استعمال کریں۔ نئے چناؤ میں چن وانگ کی بیوی بھی ہار گئی۔ مزید براں یہ کہ اسے پبلک میں کھُلے لفظوں کے ساتھ وعدہ کرنا پڑا کہ آئندہ وہ بہتر بننے کی کوشش کرے گی۔

یہ تو گاؤں میں تبدیلیاں ہوئیں۔ اب ان دونوں امرہیتیوں کو لیجیے جن کے تذکرے سے کہانی شروع ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان میں بھی کافی تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔

ضلع حاکم کی عدالت کے احاطے میں نوجوان عورتوں کے ہجوم کے ہاتھوں جب سے پری زاد کے وقار میں خلل پڑا تھا اور اس کی سُبکی ہوئی تھی وہ اس دن سے بالکل بدل گئی۔ اس نے اپنے کیریکٹر میں خود سُدھار کیا۔ گھر واپس آنے کے بعد وہ دیر تک آئینہ کے سامنے بیٹھی ہوئی اپنی شکل وصورت کا جائزہ لیتی رہی۔ پہلے بھی وہ جائزہ لینے کی عادی تھی مگر صرف اپنی تعریف کی خاطر۔ اب کی بار یہ عادت ٹوٹی۔ اس کے جھریوں پڑے چہرے، اپنی ذات سے بے اطمینانی اور بے چینی کے آثار صاف ظاہر تھے۔ اب اسے پاؤڈر، لالی، لپ اسٹک

اور جھک بھڑک سے نفرت ہوگئی تھی۔ پھر وہ یہ بھی سوچنے لگی کہ تھوڑے دنوں میں خود میں ایک شادی شدہ بیٹی کی ماں بن جاؤں گی۔ غالباً اس کے بعد بیہودہ بات ہوگی کہ میں ایک پرانی آبرو باختہ عورت کی طرح اِدھر اُدھر گھومتی پھروں ایک دم فیصلہ کرتے ہی اس نے اپنا لباس قطعی طور پہ بدل ڈالا۔ اور وہ انسانیت کے ایک شاندار نمونے کے سانچے میں ڈھل گئی۔ ایک ایسی ہستی جسے "ماں" کہنے کو یا "خالہ" کہنے کو جی چاہے اور ان خطاؤں میں کوئی بھی ایسا تمسخر آمیز نظر نہ آئے وہ جو گھر میں اس نے درگاہ بنا رکھی تھی جہاں پہنچ کر وہ پچھلے تیس برس سے آسمانی احکام اور جادو منتر سنایا کرتی تھی ایک شام اپنی جگہ سے صاف کر دیا گیا۔ اور پھر کبھی نظر نہ آیا۔

رہے کننگ منگ دوم، وہ جب ضلع سرکار کے یہاں سے گھر لوٹے تو انھوں نے آتے ہی اپنی بیوی سے پھر یہی رونا رویا کہ لڑکا لڑکی کے ستارے ٹکرا گئے ہیں۔ دونوں کے زائچے نہیں ملتے۔ لیکن اب بڑی بی اس روزمرہ کی بے ہودہ پیش گوئیوں سے عاجز آ چکی تھی۔ "تمھاری جو یہ بے وقوفی کی پیش گوئیاں۔ زائچے اور غیب دانیاں ہیں ان پہ لعنت بھیجو۔" وہ زور سے چیخی۔ "انھوں نے تو تم کو بتایا تھا کہ شیاؤ ارہ ہی پہ کوئی بڑی مصیبت آنے والی ہے۔ بڑی خوفناک مصیبت کا سامنا ہے۔ تم ہی تو کہتے تھے؟ بڑھاپے میں تم سٹھیا گئے ہو خبطی کہیں کے۔ تم جب تک اپنی بے ہودہ پیش گوئیوں اور جنتر منتر کا سارا زور نہ لگا لو اس وقت تک نوالہ نہیں توڑتے۔ مگر ان سے تمہیں آج تک کیا فیض پہنچا؟ مجھے تو غیب دانی کا کوئی دعویٰ نہیں ہے مگر صاف نظر آتا ہے کہ شیاؤ چن بڑی اچھی لڑکی ہے۔ وہ ہمارے گھر کی لکشمی اور اچھی بہو بن کر آئے گی۔ یہ زائچے اور جنم پتری کی بکواس بالکل فضول ہے۔ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ ایک تم ہو اور تمہارا وہ جملہ "بوائی کے لئے نامناسب وقت" والا۔ ذرا گریبان میں منھ ڈال کر دیکھو اور

یاد کرو، اس کا انجام کیا ہوا تھا؟"

بیوی کی زبان سے یہ بوچھار سن کر بوڑھے جوتشی کو اتنی ہمت نہ ہوئی کہ اپنی فال پر اور فال کے نتیجوں پر زیادہ زور دے سکتا۔

قصہ مختصر یہ کہ جب شیاؤ اور راہی لوٹ کر گھر آئے تو زمین پہلے سے ہموار ہو چکی تھی۔ ان دونوں کے لئے خاص مسرت کا سامان یہ تھا کہ بوڑھوں نے اپنا اڑیل پن چھوڑ دیا تھا، وہ اب راہ میں حائل نہ ہوئے اور پڑوسیوں کی مدد سے دونوں کی شادی کا انتظام کیا گیا۔

اُن سے بڑھ کر پُر مسرت جوڑی، شادماں اور کامراں جوڑی شاید مشکل سے ہی ملتی۔ ایک نمونے کا شوہر تھا اور دوسری قابلِ مثال بیوی۔ مگر تھے تو ابھی بچے ہی۔ چناں چہ جہاں کہیں انھیں اپنے کمرے میں تنہائی ملتی وہ ایک دوسرے کو خوب تنگ کیا کرتے۔ راہی اس سے کہتا، تم نے مجھ سے بیاہ کر کے غلطی کی۔ اسی شٹرو وہ سے بیاہ رچالیتیں "تاکہ تمہارے پچھلے جنم کے کرموں کا پھل مل جاتا۔ اسے جب مذاق سوجھتا تو وہ پری زاد کا سوانگ رچاتا اور اس طرح گویا اس پر دیوی اتر آئی ہیں اور آسمانی حکم سنا رہی ہیں کہ "شادی بیاہ تو سورگ میں ہوتے ہیں۔ سنجوگ اُوپر سے بن کر آتا ہے۔"

اس کے جواب میں شیاؤ چن اپنا انتقام لیتی تو وہ اپنے سسر کنگ منگ کی نقل کرتی۔ گویا وہ ضلع حاکم کے سامنے دو زانو جھکے ہوئے ہیں اور پکار رہے ہیں "حضور رحم کیجیے۔ حضور، رحم۔ ان دونوں کے ستارے ٹکراتے ہیں۔

چناں چہ یہ ہونے لگا کہ دونوں لافانی اور آسمانی ہستیوں کے لئے انھوں نے اپنے خاص علامات اور اشارے مقرر کر لئے تھے۔ ایک اشارہ یہ تھا کہ "بیاہ اور سنجوگ اوپر ہو جاتے ہیں" دوسرا یہ کہ "زائچے ٹکراتے ہیں"۔ لیکن آسمانی اور غیب داں

ہستیوں نے ان دونوں کی جوڑی کے نامناسب ہونے کی جو پیش گوئی کر رکھی تھی، اسے ناکام بنانے اور شکست دینے کے لئے وہ دونوں ایک دوسرے سے خوب جی کھول کر محبت کرتے تھے، گرم، پرتپاک، زمینی اور مادی محبت۔ اور وفاداری کے جذبے سے ایک دوسرے کی انسانی مدد کرتے تھے۔ آپس میں ہاتھ بٹاتے تھے۔

عام فانی انسانوں کو بھلا اس سے زیادہ مسرت اور شادمانی کی امید بھی کہاں ہو سکتی ہے۔